اعلیٰ ثانوی جماعتوں کے لیے

علم التعلیم

(جنوبی ایشیا میں تعلیم کی تاریخ)

(حصہ دوم)



کوہ نور پرنٹنگ پریس ۱۴، اردو بازار لاہور

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ
21-ای-2 گلبرگ 3،
لاہور

عزیز طلبہ و طالبات

السلام علیکم!

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ آپ کا اپنا ادارہ ہے جو نصاب کے مطابق معیاری کتابیں مہیا کرتا ہے۔ نصابی ضروریات کے علاوہ ان کتابوں کے ذریعے آپ میں اسلامی اقدار اور ملک کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کا شعور اُجاگر کیا جاتا ہے۔

یہ کتابیں تجربہ کار ماہرینِ تعلیم سے لکھوائی جاتی ہیں تاہم اگر کوئی بات وضاحت طلب رہ گئی ہو تو یقیناً آپ کے اساتذہ اس کمی کو پورا کر سکتے ہیں۔ کتابوں کو مزید بہتر بنانے کے لیے آپ کے اور آپ کے اساتذہ اور والدین کے مشوروں کے لیے ہم آپ کے ممنون ہوں گے۔

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی کتابیں بورڈ کے اس خاص نشان سے پہچانی جاتی ہیں جو ہر کتاب کے سرورق پر چھپا ہوتا ہے۔

فقط والسلام
آپ کا خیر اندیش
پروفیسر سیّد زاہد حسین کاظمی
چیئرمین

علم التعلیم

(حصّہ دوم)

(جنوبی ایشیا میں تعلیم کی تاریخ)

اعلیٰ ثانوی جماعتوں کے لیے



ناشر

کوہِ نُور پرنٹنگ پریس، ۱۴/ اُردو بازار لاہور

برائے

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

سال اشاعت	ایڈیشن	بار	تعداد اشاعت
اپریل ۱۹۹۶	اول	نہم	22,000

تیار کردہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ۔ لاہور۔
منظور شدہ : وفاقی وزارت تعلیم، حکومت پاکستان اسلام آباد
بموجب مراسلہ F.3-1/85-S.S

مصنفین

ڈاکٹر محمد مرزا

منور ابن صادق

حافظ عبدالخالق

مدیر

منور ابن صادق

محمد سخی مرزا

مسعود صدیقی ۔ سنئیر ماہر مضمون ۔ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

نگران طباعت

جواد احمد رشید۔ ماہر مضمون پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ۔ لاہور۔

ناشر : کوہِ نور پرنٹنگ پریس، ۴۳ اردو بازار لاہور

طابع : کوہِ نور پرنٹنگ پریس،

فہرست مضامین

صفحہ

پیش لفظ

علم التعلیم اعلیٰ ثانوی جماعتوں میں ایک انتخابی مضمون کی حیثیت سے شامل نصاب ہے۔ اس مضمون کے مقاصدِ تدریس کو سامنے رکھتے ہوئے نصاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پرچہ الف اساسیاتِ تعلیم اور پرچہ ب جنوبی ایشیا میں تعلیم کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ زیرِ نظر کتاب پرچہ ب کے لیے مرتب کی گئی ہے۔ یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ جن میں سے پہلے دو ابواب میں جنوبی ایشیا میں تعلیم کے تاریخی ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے مسلمانوں کے دورِ حکومت اور برطانوی دور کے نظام ہائے تعلیم کے نمایاں پہلوؤں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریکات اور اُن کے نتیجے میں تعلیمی، مذہبی، سیاسی اور معاشرتی اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں پاکستان کی مختلف تعلیمی پالیسیوں اور دیگر دستاویزات کے حوالے سے نظامِ تعلیم کے اہم پہلوؤں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ پانچواں باب پاکستان کے اہم تعلیمی مسائل کے جائزے اور اُن کے مجوزہ حل کی بحث پر مشتمل ہے۔ اس طرح یہ کتاب علم التعلیم کے طلبہ کو ایک طرف تو جنوبی ایشیا میں تاریخِ تعلیم کا شعور عطا کرے گی اور دوسری طرف قیامِ پاکستان کے بعد کے تعلیمی امور و مسائل کے متعلق آگاہی کے ذریعے انھیں ایک اچھا شہری بننے میں مدد دے گی۔ اس شعور و آگاہی کی بنا پر ایسے افراد اگر پیشۂ تدریس کو اختیار کریں گے تو امید ہے کہ وہ علم التعلیم کے موزوں پس منظر کی وجہ سے پاکستان میں تعلیمی عمل کی تنظیم و تشکیل میں بہتر کردار ادا کر سکیں گے۔

مدیران

باب 1

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جنوبی ایشیاء میں مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کے نمایاں خدوخال

پس منظر

مسلمانوں نے جنوبی ایشیا میں جو علوم و فنون کے دریا بہائے ، ان کا سرچشمہ صحرائے عرب سے پھوٹا تھا ۔ پیغمبر اسلام محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ کے کوہ صفا کے پہلے خُطبہ سے جس تعلیمی تحریک کا آغاز کیا تھا ۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے پورے عالم میں پھیل گئی اور اس کے نتیجے میں اسلام قبول کرنے والوں کی زندگی میں ایک ہمہ گیر صالح انقلاب رونما ہوگیا ۔

اسلامی نقطہ نظر سے تعلیم و تعلم کو ایمان و تقوٰی کی روح کی حیثیت حاصل ہے ۔ چنانچہ قرآن و سنت کی تصریحات کے مطابق یہ مبارک عمل عبادت اور جہاد سے بھی بہتر ہے ۔ اسلامی نقطہ نظر سے علم کا حصول فرد کا حق نہیں بلکہ اس کا فریضہ ہے اور اسلامی حکومت کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ افراد معاشرہ کے لیے حصول علم کے مواقع عام کرے ۔

اسلام کے اسی انقلابی تصور تعلیم کے باعث سیاسی غلبہ کے ساتھ ساتھ علوم و فنون کی امامت بھی مسلمانوں کے ہاتھ آگئی ۔ انھوں نے جن ممالک کو بھی فتح کیا ، وہاں علمی ذوق و شوق بھی وہ اپنے ساتھ لے گئے ۔ اور ان کی علم پروری نے ہر جگہ تعلیم کی ترویج و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا ۔

یہ تعلیمی روایت مسلمانوں کے ساتھ جنوبی ایشیا میں بھی پہنچی ۔ مسلمانوں کی آمد کے وقت یہ خطہ جہالت اور گمراہی کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا ۔ پتھر کے بت پوجے جاتے تھے ۔ مظاہر فطرت کو دیوتاؤں کی حیثیت حاصل تھی ۔ ذات پات کی تقسیم نے انسان کو معزز اور ذلیل طبقات میں تقسیم کر رکھا تھا ۔ تعلیم و تعلم پر صرف برہمن طبقے کی اجارہ داری تھی ۔ کھشتری اور ویش اپنی ضرورت کے لیے تعلیم حاصل تو کر سکتے تھے لیکن تعلیم و تدریس کے پیشے میں برہمنوں کے ساتھ شرکت کی جرأت نہیں کر سکتے تھے ۔ شودر پیدائشی طور پر ذلیل سمجھے جاتے تھے ۔ ان کا کام دوسرے طبقوں کی خدمت کرنا تھا ۔ تعلیم کے دروازے ان پر بالکل بند تھے ۔ حتّٰی کہ مذہبی منتر اور بھجن کی آواز اگر ان کے کانوں میں پڑ جاتی تو ہندو عقیدے کے مطابق وہ منتر یا بھجن ناپاک ہو جاتا ۔ اور اس جرم میں شودر کے کان میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جاتا ۔ تاکہ وہ دوبارہ کسی منتر یا بھجن کو سننے کی جسارت نہ کر سکے ۔

اس کے برعکس مسلمان وسیع النظر ، انسانی مساوات کے قائل اور دوسروں کے ساتھ ہمدردی و محبت کا برتاؤ کرنے والے تھے ۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایفائے عہد ، رواداری اور عدل و انصاف جیسی اعلیٰ اقدار کے مالک تھے ۔ اور ان کے نزدیک عزت و وقار کا اصل معیار نیکی اور تقویٰ تھا ۔

اسلامی تعلیمات کی ان اعلیٰ خصوصیات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنوبی ایشیا کی مقامی آبادی میں سے بکثرت لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے ۔ اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ برصغیر میں علم کی اشاعت بھی عام ہو گئی ۔ مسلمانوں کے انقلابی تصور تعلیم کے زیر اثر ہندو معاشرے میں بھی تبدیلی آئی اور ان میں عمومی تعلیم کا تصور فروغ پا گیا ۔

جنوبی ایشیا کے مسلمان حکمران ، امراء اور نواب حتّٰی کہ عوام بھی اسلام کے ہمہ گیر تصور تعلیم سے بخوبی آگاہ تھے ۔ اکثر حکمران اور امراء خود بڑے عالم فاضل تھے ۔ لیکن جو خود علم و فضل کے اعتبار سے زیادہ خوش قسمت نہ تھے جیسے علاؤالدین خلجی یا مغل شہنشاہ اکبر ، وہ بھی علوم و فنون کے فروغ میں حد درجہ فراخ دل تھے ۔ چنانچہ انھوں نے تعلیم کو عام کیا ۔

مساجد تعمیر کرائیں اور ان کے ساتھ اور الگ بھی مدارس اور دارالعلوم بھی قائم کرائے ۔ اساتذہ اور طلبہ کے لیے وظائف اور مالی امداد کی سہولتیں فراہم کیں ۔ اس طرح جنوبی ایشیا میں ایک ایسا نظام تعلیم قائم ہوگیا ۔ جس نے برصغیر میں تعلیم کو عام کر دیا ۔

نظامِ تعلیم کے نمایاں پہلوؤں کا جائزہ

ذیل میں جنوبی ایشیاء میں مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کے مختلف پہلووں کا جائزہ لیا جاتا ہے ۔ جن میں مقاصدِ تعلیم ، نصابِ تعلیم ، حکمت تدریس اور امتحانات شامل ہیں ۔

مقاصدِ تعلیم

کسی بھی نظام تعلیم میں مقاصد کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے ۔ مقاصد تعلیم ہی کے مطابق نصاب تعلیم طریق تدریس اور دیگر تدریسی سرگرمیاں متعین کی جاتی ہیں ۔ اسلامی دور کے برصغیر میں مقاصد تعلیم مندرجہ ذیل تھے ۔

1 - حصولِ رضائے الٰہی

رضائے الٰہی مسلمانوں کی زندگی کا سب سے اہم مقصد ہے ۔ اس لیے مسلمانوں کی تعلیم کا بنیادی مقصد بھی قدرتی طور پر رضائے الٰہی کا حصول رہا ہے ۔ چنانچہ تعلیم کے ذریعے انسانی شخصیت کی تعمیر اس نہج پر کرنا مطلوب رہا کہ مسلمان بندگی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اللہ کی رضا حاصل کر سکے ۔ اسلامی تعلیم کے اس مقصد کی بنیاد حضورؐ کا فرمان ہے کہ جس شخص نے رضائے الٰہی کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لیے علم حاصل کیا اور خدا کے علاوہ اس کی طلب میں کوئی دوسری غرض رہی تو اس کا ٹھکانا خدا جہنم میں بنائے گا ۔

2 - غلبہ اسلام

آخرت کی کامیابی کے ساتھ ساتھ تمکن فی الارض یعنی غلبہ اسلام کو بھی مسلمانوں کے نزدیک مقصد زندگی اور مقصد تعلیم کی حیثیت حاصل رہی ہے ۔ اسلام اس دنیا میں ایک غالب قوت کی حیثیت سے آیا ہے ۔ اس لیے تعلیم و تربیت میں اسلام کا ہمیشہ یہ مقصد رہا ہے

کہ وہ مسلمانوں کو غلبہ دین کے لیے تیار کرے ۔

3- تعمیر کردار

اسے بھی تعلیم کے ایک اہم مقصد کی حیثیت حاصل رہی ہے ۔ علماء اور اساتذہ نے اس کے حصول پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے اپنی زندگی کو طلبہ کے سامنے نمونے کے طور پر پیش کیا ۔ حدیث اور سیرت کا مطالعہ اس مقصد کے حصول کا مفید ذریعہ ثابت ہوئے ۔

4۔ متوازن نشوونما

ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کی متوازن نشوونما اسلامی تعلیم کے مقاصد میں شامل رہی ہے ۔ اس کے حصول کے لیے دوسرے علوم و فنون کے ساتھ ساتھ فنون حرب کو بھی تعلیمی سرگرمی کا درجہ حاصل رہا ہے ۔

نصابِ تعلیم

مسلمانوں کے نصاب تعلیم میں قرآن حکیم کو ہمیشہ مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے ۔ باقی تمام علوم اسی کی تفہیم و تشریح کے لیے شامل نصاب ہوتے رہے ۔ مثلاً قرآن حکیم میں بار بار مشاہدہ کائنات کی تاکید ملتی ہے ۔ اس تقاضے نے سائنس کے علم کو مدون مضمون کی شکل دے کر نصاب بنا دیا ۔ تعلیماتِ قرآنی پر اعتراضات کے جواب دینے کے لیے فلسفیانہ علوم خاص طور سے علم کلام وجود میں آیا ۔ معرفت نفس کا تقاضا علم نفسیات کو وجود میں لایا ۔ عربی زبان و ادب کو فہم قرآن کے لیے اہم حیثیت حاصل ہوگئی ۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ علوم و فنون مستقل حیثیت اختیار کر گئے ۔ مسلمانوں نے ان علوم وفنون کو بام عروج تک پہنچایا ۔ اسلامی دور کے برصغیر کے مدارس میں ان علوم کی تحصیل کے لیے مروج نصاب میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں ہوتی رہیں ۔ اس کا جائزہ مختلف ادوار کے حوالے سے لیا گیا ہے ۔ نصاب کی تکمیل کے لیے تعلیمی ہیئت عموماً مندرجہ ذیل درجات پر مشتمل رہی ۔

1 - ابتدائی تعلیم

جس میں معمولی لکھنا پڑھنا اور ناظرہ قرآن کی تعلیم شامل تھی ۔ اس درجے میں طلبہ و طالبات عموماً اکٹھے تعلیم حاصل کرتے تھے ۔

2 - ثانوی تعلیم

اس میں زندگی کی ضروریات ، دفتری اور قانونی امور کے لیے دنیوی تعلیم دی جاتی تھی ۔ نصاب میں حساب ، تاریخ ، اخلاقیات ، فقہ اور خوش نویسی کے مضامین شامل تھے ۔ فارسی زبان ذریعۂ تعلیم تھی ۔

3 - اعلیٰ تعلیم

اس میں فلسفہ ، منطق ، علم الکلام ، تفسیر و حدیث کی تعلیم شامل تھی ۔ اس سطح پر ذریعۂ تعلیم عربی تھی ۔

اعلیٰ تعلیم کے نصاب کا جائزہ درج ذیل تین ادوار کے حوالے سے کیا جا سکتا ہے ۔

دورِ اول

یہ دور برصغیر میں مسلمانوں کے تعلیمی نظام کے آغاز سے عہدِ اکبری تک محیط ہے ۔ یہ کوئی دو سو سال کا عرصہ ہے ۔ اس دوران میں عربی زبان و ادب ، تفسیر ، حدیث ، فقہ ، منطق ، کلام اور تصوف شامل نصاب تھے ۔

دورِ ثانی (عہد اکبری سے درس نظامی کے آغاز تک)

دورِ اول کے نصاب میں سکندر لودھی کے زمانے میں فلسفہ و منطق کی طرف جو رجحان ہوا تھا ۔ دورِ اکبری کے وزیر فتح اللہ شیرازی نے اسے مزید ترقی دی ۔ عہد اکبری مذہبی آزادی کا دور تھا ۔ قرآن و حدیث پر مشتمل علوم یعنی نقلی علوم پر زور دار تنقید اور عقلی علوم

(فلسفہ ، منطق) کا دور دورہ ہوا ۔ نصاب میں مختلف مضامین کی درسی کتب میں بھی مختلف تبدیلیاں کی گئیں ۔ ایک نئے مضمون طب کا نصاب میں اضافہ ہوا ۔

دورِ ثالث

مُلا نظام الدین سہالوی اورنگ زیب کے دور کے ایک مشہور عالم تھے ۔ انھوں نے دور اکبری کے نصاب میں ترامیم اور اضافے کرکے ایک نیا نصاب ترتیب دیا ، جو درس نظامی کے نام سے برصغیر کے کم و بیش تمام دینی مدارس میں رائج ہوا ۔ یہ نصاب بھی دور ثانی کے نصاب کے مطابق تھا ۔ لہٰذا معقولات کی طرف مزید جھکاؤ ہوا ۔ اس کے علاوہ مختلف مضامین کی درسی کتب میں نمایاں تبدیلیاں کی گئیں ۔ اس سلسلے میں عام رجحان یہ تھا کہ ہر علم و فن کی مشکل سے مشکل کتاب طلبہ کے مطالعے میں آجائے ۔ اس نصاب کے زیر اثر معقولات کے مقابلہ میں نقلی علوم سے بے توجہی اسلامی مدارس کے نصاب کی روایت بن گئی تو شاہ عبدالرحیم نے مدرسہ رحیمیہ دہلی میں قرآن و حدیث کو نصاب میں دوبارہ مرکزی حیثیت دینے کی تحریک شروع کی ۔ شاہ عبدالرحیم کے بعد ان کے عظیم اور قابل فرزند حضرت شاہ ولی اللہ نے اس تحریک کو مزید آگے بڑھایا ۔ انھوں نے مروجہ نصاب پر متوازن تنقید کرتے ہوئے علمِ حدیث کی ترویج کے لیے بھرپور کوشش کی ۔ اس تحریک کے مثبت اثرات مرتب ہوئے اور بعض ترامیم اور اضافوں کے ساتھ درس نظامی آج بھی برصغیر کے بیشتر مدارس میں مروج ہے ۔

درس نظامی کی خصوصیات

درس نظامی کی اہمیت کے پیش نظر اس کی خصوصیات مختصراً پیش کی جاتی ہیں ۔

1 ۔ اس نصاب میں فلسفہ ، منطق وغیرہ کی نسبت قرآن و حدیث پر توجہ بہت کم تھی ۔

2 ۔ جغرافیہ ، تاریخ کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے ۔

3 ۔ درس نظامی میں صرف و نحو پر متعدد کتب ہیں ۔ جب کہ ادب پر صرف تین یا چار

کتابیں ہیں ۔

4 ۔ اس نصاب میں معلومات کی وسعت کی بجائے فہم اور تدبر و تفکر پر زیادہ زور دیا گیا ہے ۔

اس دور کے نصاب تعلیم سے نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں منقولات کی نسبت معقولات زیادہ اہمیت اختیار کر گئے تھے اور مجموعی طور پر نصاب بوجھل ہوتا چلا گیا ۔

حکمتِ تدریس

نصاب کو موثر انداز میں طلبہ تک پہنچانے کے لیے مؤثر حکمت عملی کی ضرورت ہے ۔ اس کے لیے اصول نفسیات اور طریق تدریس کا صحیح فہم ہونا ضروری ہے ۔ نظام تعلیم کا یہ پہلو اطلاقی و عملی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس کی وسعت بڑی تفصیلات کی متقاضی ہے ۔ لیکن ذیل میں مجمل طور پر مختلف مدارج میں استعمال کی جانے والی تدریسی تدابیر پر ایک نظر ڈالی گئی ہے ۔

ابتدائی تعلیم

مکاتب میں بچوں کی تعلیم کا باقاعدہ اور رسمی آغاز چار سال ، چار ماہ اور چار دن کی عمر میں رسم بسم اللہ کی تقریب سے ہوتا تھا ۔ استاد بچے کے عزیز و اقارب کی موجودگی میں اسے بسم اللہ ، سورۃ العلق کی ابتدائی آیات اور سورۃ فاتحہ پڑھاتا تھا ۔

بچوں کو پہلے پڑھنا سکھایا جاتا تھا ۔ حروف تہجی اور ان کی مختلف صورتوں کی پہچان کرانے کے بعد حروف کو ملا کر پڑھنے کی تربیت دی جاتی تھی ۔ اس کے بعد جملے پڑھائے جاتے تھے ۔ (اکبر نے لکھنا اور پڑھنا ایک ساتھ شروع کرانے کو رواج دیا) چنانچہ حروف تہجی لکھائے جاتے تھے ۔ حروف کی شکلیں اور نام یاد ہو جانے پر لکھائی کی مدد سے پڑھنا سکھایا جاتا تھا ۔ مسلسل مشق کے بعد طلبہ رواں پڑھنے کے قابل ہو جاتے تھے ۔

ثانوی و اعلیٰ درجات میں حکمتِ تدریس

ثانوی اور اعلیٰ مدارس میں مندرجہ ذیل تدریسی طریقے رائج تھے ۔

1 ۔ تقریری طریقۂ تدریس

2 ۔ درسی کتب کا طریقہ

3 ۔ بحث و مباحثہ

4 ۔ گہرامطالعہ

1 ۔ تقریری طریقہ تدریس

یہ قدیم طریقہ تدریس عام طور پر تمام مدارس میں مروج تھا ۔ اساتذہ مضمون کے بارے میں لیکچر دیتے تھے اور طلبہ ضروری نکات نوٹ کر لیتے ۔ سبق کے دوران طلبہ سوالات کے ذریعے اپنی مشکلات دور کر لیتے تھے ۔ اساتذہ بھی تعلیم کا جائزہ لینے کے لیے سوالات کرتے تھے ۔

2 ۔ درسی کتب کا طریقہ

اس طریقے میں استاد خود درسی کتاب سے کچھ حصہ پڑھتا تھا یا کسی طالب علم سے کتاب پڑھواتا تھا ۔ استاد عبارت کے مشکل مقامات کی تشریح کرتا جاتا تھا ۔ حسب ضرورت طلبہ سوالات کے ذریعے بھی اپنی مشکلات حل کرا لیتے تھے ۔

3 ۔ بحث و مباحثہ

تدریس میں گہرائی کے لیے بحث کی اہمیت مسلمہ ہے ۔ اس طریقے کے لیے طلبہ پہلے سے سبق کا مطالعہ کر کے آتے تھے اور پھر شاگرد اور استاد کے سوالات ، بحث و مباحثہ کی صورت اختیار کر لیتے تھے ۔ اس کے علاوہ مشہور اساتذہ کے درس میں ہم عصر علماء بھی شریک ہوتے تھے ۔ لہٰذا بحث و مباحثہ کا معیار بھی بلند ہوتا تھا ۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے یہ طریقہ بڑی کامیابی سے رائج رہا ۔

4- گہرا مطالعہ

گہرے مطالعے کا طریقہ آج بھی سنجیدہ طلبہ کے لیے بہت کامیاب تصور کیا جاتا ہے۔ اسلامی تعلیم کے اعلیٰ مدارس کے طلبہ نحو کتب کا مطالعہ کرتے اور کتاب کے ایک ایک لفظ پر غور کرتے تھے۔ نیز تمام ممکنہ اعتراضات کے جوابات مرتب کرتے تھے۔ مطالعے میں پہلے عبارت اور ترجمہ پر توجہ دی جاتی تھی۔ بعد میں اصل مطالب اور مدعا پر غور کیا جاتا تھا۔ مشکل کی صورت میں بار بار مطالعے کے ذریعے اصل مدعا تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اساتذہ کے سامنے صرف انتہائی پیچیدہ مسائل پیش ہوتے تھے۔

مانیٹوریل سسٹم

مدارس میں مانیٹوریل سسٹم موجود تھا۔ اعلیٰ درجات کے طلبہ ابتدائی درجات کے طلبہ کو تعلیم دیتے تھے اور نظم و نسق کی ذمہ داری بھی ادا کرتے تھے۔ استاد کی تدریس کے ساتھ ہی ایک طالب علم بلند آواز کے ساتھ سبق دہراتا جاتا۔ دہرانے والے طالب علم کو معید کہا جاتا تھا۔

امتحانات

مسلمانوں کے نظام تعلیم میں نظام امتحانات اتنا ترقی یافتہ نہ تھا جتنا موجودہ دور میں ہے۔ اساتذہ اپنے شاگردوں کی تعلیمی تحصیل کا جائزہ لے کر انھیں اگلے درجے میں ترقی دے دیتے تھے۔ طلبہ سے روزانہ یا ہفتہ وار آموختہ سننے کی باقاعدہ روایت موجود تھی۔ اساتذہ سبق کے دوران میں بھی طلبہ کی اہلیت کا جائزہ لیتے رہتے تھے۔ استاد اور شاگرد کا گہرا رابطہ بھی جائزے میں بہت مفید ثابت ہوتا تھا۔ آخری مدارج کی تکمیل پر سند فضیلت عطا کرنے کی روایت کی شہادت بھی ملتی ہے۔ جہاں تک رسمی امتحانات کا تعلق ہے سب سے پہلے محمد عادل شاہ والئ بیجاپور نے سالانہ امتحانات کا سلسلہ شروع کیا جو ذی الحجہ میں ہوتے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر نے بھی ایک خصوصی حکم کے ذریعے ماہانہ امتحانات منعقد کرانے کا اہتمام کیا تھا۔

نظام امتحانات کی باقاعدہ صورت نہ ہونے کے باوجود درباری مناصب اور اعلیٰ ملازمتوں کے حصول کے لیے مقابلے کی ایک زبردست فضا موجود تھی ۔ ملک الشعراء کے انتخاب کے لیے دور دراز سے شعراء آتے تھے ۔ اسی طرح دیگر مناصب کے لیے بھی عملی طور پر اپنی اہلیت ثابت کرنا ضروری تھا ۔ اس طرح عملی طور پر پبلک امتحانات کا ایک نظام بہر حال موجود تھا ۔

نظامِ مدارس

مسلمانوں کے نظام تعلیم کی اہم خصوصیات اس نظام کی داخلی آزادی تھی ۔ حکمران ، امراء اور دولت مند لوگ مدارس قائم کرتے تھے ۔ اور ان کی مالیات کی ذمہ داری برداشت کرتے تھے لیکن علماء اور اساتذہ ان مدارس کے نصاب ، طریق تدریس ، اوقات کار اور دیگر علمی امور کے سلسلے میں پوری طرح آزاد تھے ۔

برصغیر میں مندرجہ ذیل نوعیت کی درسگاہیں قائم تھیں ۔

1 ۔ سرکاری مدارس ۔
2 ۔ مساجد میں قائم درسگاہیں ۔
3 ۔ خانقاہوں اور مزارات سے ملحق مدارس ۔
4 ۔ علمائے کرام کے قائم کردہ مدارس سے ملحق درسگاہیں ۔

1 - سرکاری مدارس

بڑے شہروں میں قائم اکثر مدارس اور اعلیٰ تعلیم کے بیشتر ادارے حکمرانوں کی سرپرستی میں چلتے تھے ۔ بعض امراء اور رؤسا بھی ان مدارس کے اخراجات کی کفالت میں شرکت کرتے تھے ۔ سرکاری مدارس کے لیے جاگیریں وقف کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر قسم کی مالی امداد کا انتظام بھی کیا جاتا تھا ۔ ان مدارس میں مشہور علماء کو بطور اساتذہ مقرر کیا جاتا تھا ۔ طلبہ کو تعلیمی وظائف ملتے تھے ۔

حکمرانوں کے قائم کردہ مدارس میں فیروز شاہ تغلق کی قائم کردہ جامعہ فیروز شاہی کو اپنی عظمت اور شان و شوکت کے اعتبار سے ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی ۔ یہ ایک اقامتی درسگاہ

تھی ۔ اساتذہ اور طلبہ کے لیے معقول مشاہروں اور وظائف کا انتظام تھا ۔ مدرسۂ ہمایونی بھی ایک اعلیٰ ادارہ تھا ۔ اس عظیم مدرسے کے علاوہ ہمایوں کا مقبرہ بھی ایک طویل عرصہ تک بطور مدرسہ استعمال ہوتا رہا ۔ اکبر کی سرپرستی میں جامع فتح پور سیکری بھی عظیم تعلیمی درسگاہ تھی ، جو اکبر کی اشاعت تعلیم میں دلچسپی کو ظاہر کرتی ہے ۔

شاہ جہاں نے دہلی میں مدرسہ دارالبقاء قائم کیا جس کے اساتذہ کا تقرر بھی بادشاہ خود کرتا تھا ۔ اکبر کے دور میں خیرالمنازل کے نام سے ایک عظیم درسگاہ قائم کی گئی تھی ۔ اورنگ زیب نے فرنگی محل میں عظیم الشان جامعہ قائم کی ۔

2 - مساجد میں قائم تعلیمی درسگاہیں

مسلمانوں کے نظام تعلیم میں مسجد کو ہمیشہ مرکزی حیثیت حاصل رہی ۔ مدینہ منورہ میں صفّہ کو اسلام کی اولین درسگاہ کا مقام حاصل ہے ۔ یہ درسگاہ مسجد نبوی ہی میں قائم ہوئی تھی ۔ اس کے بعد مسلم ممالک میں قائم ہونے والی اکثر مشہور جامعات اور مدارس مساجد میں ہی قائم ہوئے یا ان کی عمارات مساجد سے ملحق تھیں ۔ قرآن مجید ناظرہ کی تعلیم کا انتظام مساجد میں ہی ہوتا تھا اور یہ روایت آج تک قائم ہے ۔ برصغیر میں بھی ابتدائی تعلیم کے مکاتب مسجدوں میں ہی قائم تھے ۔ ان مکاتب میں قرآن مجید ، عربی ، فارسی کی ابتدائی تعلیم ریاضی اور خوش نویسی کی تعلیم دی جاتی تھی ۔ یہ مکاتب اپنی مدد آپ کے تحت چلتے تھے ۔ ویسے مسجدوں کی سرکاری سرپرستی کی روایت بھی موجود تھی لہٰذا بالواسطہ ان مکاتب کو بھی سرکاری سرپرستی حاصل ہو جاتی تھی ۔

3 - خانقاہوں سے ملحق مدارس

صوفیاء اور مشائخ نے برصغیر میں اسلامی تعلیمات کی ترویج اور ترقی میں بہت اہم خدمات انجام دیں ۔ لوگ اکتساب فیض کے لیے پروانہ وار ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے ۔

معتقدین اور مخیر حضرات کی مالی امداد سے لوگوں کے قیام و طعام کا بندوبست بھی ہو جاتا تھا ۔ تبلیغ دین اور تزکیۂ نفس کے مقاصد کے لیے قائم ہونے والے یہ خانقاہی مراکز رفتہ رفتہ باقاعدہ مدارس میں تبدیل ہو جاتے تھے اور رسمی تعلیمی ترقی میں اپنا کردار ادا کرتے تھے ۔

4 - علماء کے مدارس

مسلمانوں میں تعلیم و تدریس کو فرض اور عبادت کا درجہ حاصل ہے ۔ اس فرض کی تکمیل کے لیے علماء عمر بھر درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے ۔ وہ رضاکارانہ طور پر کسی مسجد میں اپنا حلقہ درس شروع کرتے اور دور و نزدیک سے لوگ آکر ان کے علم و فضل سے مستفید ہوتے تھے ۔ بعض علماء اپنے گھروں میں درس و تدریس کا آغاز کر دیتے تھے اور بلا معاوضہ تعلیمی خدمت انجام دیتے تھے ۔ صاحب ثروت علماء اپنے طلبہ کے قیام و طعام کا بھی بندوبست کرتے تھے ۔ اس کار خیر میں دوسرے لوگ بھی ان کی معاونت کرتے تھے ۔

عمارات و مالیات

برصغیر میں مسلمانوں نے تعلیم کا آغاز مساجد ہی سے کیا ۔ مدارس کے لیے الگ عمارات کا انتظام نہیں تھا ۔ رفتہ رفتہ مساجد سے ملحق مدارس کے لیے علیحدہ عمارات کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا ۔ شاہ جہاں نے دہلی میں دارالبقاء کے نام سے ایک عظیم درسگاہ قائم کی ۔ اس کی عمارت جامع مسجد دھلی سے بالکل ملحق تھی ۔ اس کے علاوہ لاہور ، آگرہ ، جونپور ، گجرات اور احمد آباد میں بھی مساجد کے ساتھ ملحق درسگاہیں تعمیر ہوئیں ۔

مقابر اور خانقاہوں کے ساتھ مدارس کی عمارات بنانے کا رواج بھی تھا ۔ بہار میں خانقاہ شاہ کبیر (سہسرام) اور خانقاہ پھلواری کے ساتھ قائم مدارس خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ سرکاری مدارس کی عمارات بڑی پُرشکوہ اور عظیم الشان ہوتی تھیں جن میں طلبہ اور اساتذہ کے لیے درس و تدریس اور قیام و طعام کا بندوبست ہوتا تھا ۔

سرکاری مدارس میں اساتذہ اور طلبہ کے لیے حکومت کی طرف سے تعلیمی وظائف کا انتظام تھا۔ بعض مدارس کے مستقل اوقاف بھی تھے، جن سے ان کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔ اورنگ زیب نے خاص درجات کے طلبہ کے لیے درجہ وار وظائف مقرر کیے تھے۔ جہانگیر نے تعلیمی ترقی کے لیے باقاعدہ قانون بنا کر مدارس کے مالیات کو مستحکم کیا۔

عمومی نظم و نسق

نظام تعلیم داخلی طور پر آزاد اور خود مختار تھا، اس لیے نظم و نسق کے سلسلے میں مرکزیت کا تصور موجود نہیں تھا۔ داخلے کے سلسلے میں بھی باقاعدہ شرائط نہیں تھیں۔ نہ ہی عمر کی کوئی پابندی تھی۔ عربی مدارس میں داخلے عموماً شوال میں ہوتے تھے۔ اوقات تعلیم باقاعدہ تو نہ تھے البتہ اعلیٰ تعلیم کے مدارس میں نماز فجر سے عشاء کے بعد تک وقفوں سے تعلیم جاری رہتی تھی۔ مکاتب میں صبح سے دوپہر اور پھر ظہر کے بعد تعلیم کے اوقات تھے۔ مدارس میں باقاعدہ باہمی رابطے کا کوئی نظام نہ تھا۔ اس کے باوجود طریق تدریس، نصاب اور اوقات وغیرہ میں بہت حد تک یکسانیت پائی جاتی تھی۔ مدّت تعلیم باقاعدہ مقرر نہ تھی۔ طلبہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق سند فراغت حاصل کر لیتے تھے۔ طلبہ کے لیے فاضل، عالم اور قابل کے القابات مروج تھے جو بالترتیب منطق و حکمت، علم دین اور فنون ادبیہ کی تکمیل پر ملتے تھے۔

مدارج تعلیم

جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کے نظام تعلیم میں موجودہ دور کی اصطلاحات کے مطابق مدارج تعلیم کا تصور تو نہیں ملتا، البتہ مصنفین نے مدارس میں دی جانے والی تعلیم کی نوعیت کے پیش نظر تعلیم کو تین مدارج میں تقسیم کیا ہے۔

1۔ ابتدائی تعلیم (مکاتب)۔
2۔ ثانوی تعلیم یعنی مدارس کی فارسی تعلیم۔

3 ۔ اعلیٰ تعلیم (عربی) ۔

ان تینوں مدارج کا اجمالی تعارف نصاب تعلیم کے ضمن میں ہو چکا ہے ۔ ذیل میں اس کی تفصیل بیان کی جاتی ہے ۔

ابتدائی تعلیم

ابتدائی تعلیم کا انتظام مکاتب میں تھا ۔ یہ مکتب عموماً مساجد میں قائم ہوتے تھے ۔ ان مکاتب میں مسلمان اور غیر مسلم لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے تعلیم حاصل کرتے تھے ۔ یہ مکاتب دیہاتوں اور شہروں میں عام تھے ۔ ان مکاتب میں قرآن حکیم کی (ناظرہ و حفظ) تعلیم کے علاوہ لکھنا پڑھنا اور ابتدائی حساب سکھایا جاتا تھا ۔ مسلمان طلبہ کو وضو اور نماز کی تربیت دی جاتی تھی ۔ ان مکاتب میں ذریعہ تدریس فارسی زبان تھی ۔ فارسی کی ابتدائی کتابیں کریما ، آمد نامہ ، گلستان اور بوستان پڑھائی جاتی تھیں ۔

ثانوی تعلیم

ثانوی تعلیم مدارس میں دی جاتی تھی ۔ ان کی تعداد مکاتب کے مقابلے میں کم تھی ۔ بعض مقامات پر ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا انتظام ایک ہی درسگاہ میں ہوتا تھا ۔ اسی طرح ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا بندوبست بعض مدارس میں اکٹھا ہوتا تھا ۔ ثانوی تعلیم بھی فارسی میں دی جاتی تھی ۔ علم و ادب اور اخلاقیات کے علاوہ دنیوی ضرورت کے مضامین پڑھائے جاتے تھے ۔ ثانوی درجہ سے فراغت کے بعد حسبِ لیاقت دفتری اور سرکاری ملازمت مل جاتی تھی ۔ ثانوی درجہ میں ادب و انشاء ، نظم و نثر ، افسانہ و حکایت اور تاریخ و اخلاقیات پر متعدد فارسی کتب شامل درس تھیں ۔ اس دور کی ثانوی تعلیم آج کل کی بی اے کی تعلیم کے برابر تھی ۔ بلکہ معیار میں اس سے بھی بہتر تھی ۔

اعلیٰ تعلیم

اعلیٰ تعلیم میں صرف و نحو ، فلسفہ و منطق ، حکمت ، ریاضی ، بلاغت ، فقہ و اصول فقہ ، علم الکلام ، تفسیر اور حدیث کی تعلیم عربی زبان میں دی جاتی تھی ۔

اعلیٰ تعلیم کا نصاب سات آٹھ سال میں مکمل ہوتا تھا ، جس کی تکمیل پر دستار فضیلت حاصل کر کے فارغ التحصیل طلبہ درس و تدریس کا پیشہ اختیار کر لیتے تھے یا اپنی صلاحیت و قابلیت کی بنیاد پر قاضی کے منصب پر فائز ہو جاتے تھے ۔ جب کہ کمال فن کی بنیاد پر دربار شاہی میں مناصب بھی عطا ہوتے تھے ۔ لیکن درس و تدریس کا پیشہ سب سے معزز تصور کیا جاتا تھا ۔

فنی تعلیم

مسلمانوں نے صرف نظری علوم پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فنی تعلیم کی زبردست سرپرستی کی ۔ اس وجہ سے برصغیر میں اس زمانے میں فنی اور صنعتی تعلیم میں اتنی ترقی ہوئی کہ انڈسٹریل کمیشن کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان ، حکمرانوں کی دولت اور کاریگروں کی مہارت کی وجہ سے مشہور تھا ۔ اور یہاں کے کاریگر مہارت میں یورپ سے کہیں آگے تھے ۔ صنعتی اور فنی تعلیم کے لیے موجودہ دور کی طرح باقاعدہ تعلیمی ادارے تو نہیں تھے ۔ لیکن فنی ماہرین کے کمالات دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ فنی تعلیم کا کوئی نہ کوئی نظام ضرور موجود تھا ۔ اس نظام کے اہم مراکز کارخانہ جات اور کاریگروں کے ورکشاپ یا گھر تھے جہاں اپرنٹس شپ کے طریقے پر فنی تعلیم اگلی نسل کی طرف منتقل کی جاتی تھی ۔

تعلیم نسواں

اسلام نے تعلیم کا حاصل کرنا ہر مرد اور عورت پر فرض کیا ہے ۔ چنانچہ عالم فاضل مسلم خواتین ہر دور میں علم کی ترقی و اشاعت میں کوشاں نظر آتی ہیں ۔ مکتب کی حد تک

طلبا و طالبات عام طور پر اکٹھے تعلیم حاصل کرتے تھے ۔ یہ مکاتب چونکہ ہر جگہ قائم تھے ، اس لیے ناظرہ قرآن اور معمولی لکھنے پڑھنے کی سہولت طالبات کے لیے ہر جگہ موجود تھی ۔ بعض تعلیم یافتہ خواتین گھر میں مکتب کھول لیتی تھیں اور محلے کی بچیاں ان کے ہاں ابتدائی تعلیم حاصل کرتی تھیں ۔ یہ روایت برصغیر کے مسلمانوں میں کسی نہ کسی صورت میں آج بھی موجود ہے ۔

مغلوں نے شاہی خاندان کی خواتین کی تعلیم و تربیت پر بہت توجہ دی ۔ غیاث الدین اور اکبر اعظم کے حرم شاہی میں خواتین کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام موجود تھا ۔ حفظ قرآن اور شعر و ادب کی تعلیم کو اولیت دی جاتی تھی ۔ شاہی خاندان کی خواتین کے علاوہ امراء اور خواص کی خواتین بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرتی تھیں ۔ خان خاناں کی لڑکی نے تفسیر قرآن لکھی تھی ۔ حضرت معین الدین چشتی کی بیٹی بہت ذی علم تھی ۔ ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ خواتین میں اعلیٰ تعلیم شاہی خاندان ، علماء کے گھروں اور اونچے طبقے کی خواتین تک محدود تھی ۔ عوام میں تعلیم نسواں معمولی لکھنے پڑھنے اور قرآن ناظرہ تک محدود تھی ۔ البتہ مسلم خواتین میں خواندگی کی شرح ہمیشہ کافی معقول رہی ۔

مشقی سوالات

1 ۔ مسلمانوں کے نظام تعلیم میں مسجد کو کیا مقام حاصل رہا ہے ؟ وضاحت کیجیے ۔

2 ۔ مسلمانوں سے پہلے برصغیر کی تعلیمی حالت کے بارے میں مختصراً نوٹ تحریر کریں ۔

3 ۔ مسلم دور کے برصغیر میں تعلیم کے مختلف مدارج بیان کریں ۔

4 ۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے دور میں رائج مختلف طریقہ ہائے تدریس بیان کریں ۔

5 ۔ انتظامی اعتبار سے مسلمانوں کے تعلیمی مدارس کی اقسام بیان کریں ۔

6 ۔ مسلمانوں کے دور میں فنی تعلیم کے نظام پر تبصرہ کریں ۔

7 ۔ مسلمانوں نے تعلیم نسواں پر کس حد تک توجہ دی ۔ وضاحت کیجیے ۔

8 ۔ انتظامی امور میں آج کل کے مدارس میں ہم مسلمانوں کے نظام تعلیم سے کہاں تک فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔ دلائل سے واضح کریں ۔

9 ۔ مندرجہ ذیل بیانات .. صحیح ہیں یا غلط ۔

- درس نظامی میں معلومات کی وسعت کی بجائے تدبر و فکر اور فہم پر توجہ دی جاتی تھی ۔ ص غ
- مسلمانوں کے عہد میں ابتدائی مکاتب میں مخلوط تعلیم کا رواج تھا ۔ ص غ
- مسلمانوں کے عہد میں اعلیٰ تعلیم صرف اونچے طبقے کی خواتین تک محدود تھی ۔ ص غ
- مکاتب کی تعلیم میں فقہ پر زور دیا جاتا تھا ۔ ص غ
- مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں آبادی کے تمام طبقات کو حصول تعلیم کے یکساں مواقع میسر تھے ۔ ص غ
- مسلمانوں کے مدارس میں نظم و نسق کا باقاعدہ مرکزی نظام موجود تھا ۔ ص غ
- شاہ ولی اللہ دھلوی نے قرآن و سنت کی تعلیم کے فروغ کے لیے تحریک کا آغاز کیا ۔ ص غ
- مسلمانوں کے دور میں اعلیٰ تعلیم فارسی زبان میں دی جاتی تھی ۔ ص غ
- عربی زبان کو سرکاری اور دفتری زبان کا درجہ حاصل تھا ۔ ص غ
- درس نظامی کا آغاز مدرسہ رحیمیہ دہلی میں کیا گیا ۔ ص غ

10۔ درج ذیل بیانات میں خالی جگہ پُر کیجیے ۔

مسلمان بچوں کی تعلیم کا آغاز رسم -------- سے کرتے تھے ۔

- ابتدائی تعلیم کے لیے جا بجا------- قائم تھے ۔
- ثانوی تعلیم میں ------- زبان کو ذریعہ تعلیم کا درجہ حاصل تھا ۔
- ابتدائی مکاتب میں ناظرہ قرآن اور -------- کی تعلیم دی جاتی تھی ۔
- عہد اکبری میں منقولات کی جگہ ------- کو نصاب میں اہمیت حاصل ہوگئی ۔
- منقولات کی طرف زیادہ رجحان عہد اکبری کے وزیر ----- کے زیر اثر ہوا ۔
- درس نظامی کے بانی ملا -------- ہیں ۔
- فنی تعلیم کارخانہ جات کے علاوہ ------- دی جاتی تھی ۔
- مانیٹوریل سسٹم کا آغاز ہندوستان میں -------- نے کیا ۔
- لازمی تعلیم کا تصور پہلی دفعہ مغل بادشاہ ------- نے پیش کیا ۔
- مغل بادشاہ ------- کا مقبرہ ایک عرصہ تک مدرسہ کے طور پر استعمال ہوتا رہا ۔

باب 2

جنوبی ایشیا میں برطانوی نظامِ تعلیم کے نمایاں پہلو

جنوبی ایشیا میں اہل برطانیہ کا باقاعدہ سیاسی تسلط تو 1859ء میں ہوا جب آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا تختہ الٹ کر اسے گرفتار کر لیا گیا لیکن برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی اس خطے میں تجارت کے ساتھ سیاست کے میدان میں بھی مسلسل اپنا عمل دخل قائم کرتی رہی ۔ چنانچہ بنگال کے علاقے میں قریباً ایک سو سال یعنی 1757ء میں نواب سراج الدولہ کی شکست و شہادت کے بعد سے انگریزوں کا تسلط قائم تھا ۔ سیاست اور تجارت کے ساتھ ساتھ تعلیم کے میدان میں پرتگیزوں اور فرانسیسیوں کے مقابلے میں عیسائیت کی تبلیغ کا آغاز بھی کمپنی کی سرپرستی میں سترھویں صدی کے آغاز ہی سے ہو گیا تھا ۔ لیکن تعلیمی مورخین جنوبی ایشیا میں برطانوی تعلیمی نظام کا آغاز بالعموم 1813ء سے کرتے ہیں ۔

تعلیمی تبدیلیوں کے اہم ادوار

جنوبی ایشیا پر برطانیہ کے سیاسی تسلط کا دور 1947ء تک محیط ہے ۔ 1813ء سے 1947ء تک کے دور کو برطانوی تعلیمی پالیسیوں کے حوالے سے درج ذیل سات ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔

دور	دورانیہ	مختصر تعارف
1-	1813 سے 1835 تک	1813 کے چارٹر ایکٹ سے میکالے رپورٹ تک
2-	1835 سے 1854 تک	میکالے کی رپورٹ 1835 سے 1854 کی وڈ ڈسپیچ تک ۔

3- 1854 سے 1882 تک وڈ ڈسپیچ سے انڈین ایجوکیشن کمیشن 1882 تک ۔

4- 1882 سے 1904 تک انڈین ایجوکیشن کمیشن سے 1904 کے ریزولیوشن تک ۔

5- 1904 سے 1919 تک 1904 کے ریزولیوشن سے کلکتہ یونیورسٹی کمیشن تک ۔

6- 1919 سے 1929 تک کلکتہ یونیورسٹی کمیشن 1919 سے انڈین سٹیچوٹری کیمشن تک ۔

7- 1929 سے 1947 تک انڈین سٹیچوٹری کمیشن سے قیام پاکستان تک ۔

آئندہ چند صفحات میں پہلے برطانوی تعلیمی پالیسی کی بنیادوں کی نشان دہی کی گئی ہے اور پھر محولہ بالا ادوار میں تعلیمی تبدیلیوں کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے ۔

نئی تعلیمی پالیسی کی بنیادیں

جنوبی ایشیا میں برطانوی تعلیمی پالیسی کا بانی چارلز گرانٹ تھا ۔ چارلز گرانٹ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم تھا اور اپنے فرائض کی بجا آوری کے لیے بڑا نیک نام تھا ۔ بنگال میں اس کی عام زندگی کا اسلوب پہلے تو بڑا عیاشانہ تھا لیکن بعد میں وہ عیسائی مشنری بن گیا اور اس نے پورے ہندوستان کو عیسائی بنانے کی مہم شروع کر دی ۔ 1790 میں انگلستان واپس آیا تو اس نے برطانوی پارلیمنٹ کو اپنے موقف کے حق میں راہ ہموار کرنے کے لیے دن رات ایک کر دیا ۔ اس نے ہندوستان کی تعلیمی اور اخلاقی حالت کا کچھ ایسا نقشہ کھینچ کر دکھایا جیسے ہندوستان کے لوگ جہالت اور وحشت کا مرقع ہوں ۔ اس نے اس کا یہ علاج تجویز کیا کہ برطانوی حکومت ہندوستانیوں کی تعلیم کی ذمے داری قبول کرے ۔ انھیں مغربی علوم یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی کے علاوہ عیسائیت کی تعلیم دے اور اس مقصد کے لیے انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے ساتھ انگریزی زبان و ادب کو نصاب میں شامل کرے ۔ 1813 کے بعد برطانوی تعلیمی پالیسی میں چارلز گرانٹ کے ان تصوّرات کو بنیادی حیثیت حاصل رہی

ہے ۔ اسی لیے چارلس گرانٹ کو جدید ہندوستان کا بابائے تعلیم کہا جاتا ہے ۔

نئی تعلیم کا پہلا دور

1813 ء میں کمپنی کے نظر ثانی شدہ چارٹر میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک قرار داد کے ذریعے دفع 43 شامل کر کے کمپنی کو اختیار دیا کہ وہ ایک لاکھ روپے سالانہ کی رقم تعلیم و ادب کے فروغ کے لیے خرچ کر سکے گی اور اس مقصد کے لیے سکولوں یا دوسرے اداروں کے قیام اور علمی لیکچروں کے اہتمام کی مجاز ہوگی ۔ اس دفعہ میں درج ذیل دو تعلیمی نکات بالکل واضح تھے ۔

الف) ادب کا احیاء و ترقی اور ہندوستان کے تعلیم یافتہ باشندوں کی حوصلہ افزائی ۔

ب) ہندوستان کے برطانوی مقبوضات میں سائنسی علوم کا تعارف ۔

پہلا نکتہ واضح طور سے علوم مشرقی اور قدیم علوم سے متعلق تھا ۔ جب کہ دوسرا نکتہ جدید مغربی علوم کے متعلق تھا ۔ لیکن بعد کی برطانوی تعلیمی پالیسی میں عملاً ہر جگہ چارلس گرانٹ کے نقطہ نظر کی جھلک نظر آتی ہے ۔ اس کا لب لباب انگریزی زبان و ادب اور مغربی علم و ثقافت کی اشاعت تھا ۔ اس اعتبار سے 1813 کے چارٹر ایکٹ کو جدید ہندوستانی تعلیم کا سنگِ بنیاد قرار دیا جاتا ہے ۔

چارٹر ایکٹ 1813 ء میں تعلیم کے لیے مختص کی گئی رقم بہت کم تھی ۔ پھر اس کو تقریباً دس سال تک صحیح طور سے استعمال نہ کیا گیا کیونکہ اس دوران میں عموماً کمپنی مقامی حکمرانوں کے ساتھ لڑائیوں میں مصروف رہی ۔ 1823 ء میں تعلیم عامہ کمیٹی قائم کی گئی لیکن وہ بھی تقریباً دس سال تک غیر فعال رہی ۔

1813 ء سے لے کر 1835 ء تک کے اس پہلے دور میں کمپنی کے چارٹر کے حوالے سے بعض انگریزوں نے ہندوستان میں تعلیم کی اشاعت کے لیے مخلصانہ کوششیں بھی کیں ۔ لیکن کمپنی سرکار نے ان کی کبھی حوصلہ افزائی نہ کی ۔

کمپنی نے گورنر مدراس کو ہدایت کی کہ گورنر بنگال کی طرح اپنے علاقے کے صرف اعلیٰ طبقے کے ہندوستانیوں کو اعلیٰ مغربی تعلیم سے مسلح کریں تاکہ ان سے کمپنی کی ملازمت میں کام لیا جا سکے گویا کمپنی کی نظر میں تعلیم کا مقصود محض ملازمین سرکار کا حصول تھا۔

1813ء 1835ء تک اہم تعلیمی واقعات کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

1- 1815ء میں سرکاری سطح پر بمبئی ایجوکیشن سوسائٹی قائم کی گئی۔

2- 1816ء میں کلکتہ ودیالیا کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا گیا۔

3- 1819ء میں اسے کالج بنا دیا گیا۔ اس میں ہندوستانیوں کو انگریزی ذریعۂ تدریس سے اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ ہندوستان کا پہلا گورنمنٹ کالج تھا۔

4- 1833ء میں چارٹر ایکٹ میں ترمیم کے ذریعے تعلیم کے لیے مختص رقم ایک لاکھ روپے سالانہ سے بڑھا کر دس لاکھ کر دی گئی۔

اس دور میں مشنری اداروں کی کوششیں بھی ساتھ ساتھ جاری رہیں۔

دوسرا دور

برطانوی ہند میں جدید تعلیم کا دوسرا دور 1835ء سے 1854ء تک محیط ہے۔ اس کا آغاز لارڈ میکالے کی یادداشت کی منظوری سے ہوتا ہے۔ لارڈ میکالے 10 جون، 1834ء کو ہندوستان آیا۔ وہ گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن قانون تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تعلیم عامہ کمیٹی کا صدر بھی تھا۔ اسی زمانے میں یعنی 1834ء میں اس کمیٹی کے سامنے یہ قضیہ فیصلے کے لیے پیش ہوا کہ ذریعۂ تدریس انگریزی ہو یا مشرقی زبانیں۔ اس مسئلے پر کمیٹی کے ارکان برابر برابر تقسیم ہو گئے لہذا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ خود میکالے نے کمیٹی کے اجلاس میں قضیے پر اپنی ذاتی رائے محفوظ رکھی۔ لیکن جب معاملہ آخری فیصلے کے لیے گورنر جنرل کی کونسل کو ارسال کیا گیا تو 2 فروری 1835ء کو میکالے نے اس مسئلے پر جو یادداشت گورنر جنرل کی کونسل کو پیش کی اس میں اس نے اپنا پورا زور قلم اس موقف پر صرف کیا کہ ہندوستان کے قدیم نظام علم و ادب کو بالکل تہس نہس کر دیا جائے اور ہندوستانیوں کی جملہ

معاشرتی و معاشی برائیوں کے خاتمے کے لیے اس کی بجائے انگریزی زبان اور یورپی علوم کو ہندوستان میں نافذ کیا جائے ۔ اس کے ساتھ اس نے انگریزی زبان کو تمام دیگر علوم کے لیے بھی ذریعۂ تدریس بنانے کی وکالت کی اور دھمکی دی کہ اگر اس کی تجویز منظور نہ کی گئی تو وہ احتجاجاً کمیٹی سے مستعفی ہو جائے گا ۔ میکالے کے لیے حالات سازگار رہے کہ خود گورنر جنرل لارڈ بنٹنگ بھی ہندوستان میں انگریزی علم و ادب کے فروغ کے متعلق ایسے ہی تصورات رکھتا تھا ۔ چنانچہ اس نے میکالے کی یادداشت پر منظوری کی مہر ثبت کر دی اور 7 مارچ 1835 ء کو اپنی کونسل سے الگ قرار داد پاس کرا کے ایک سرکاری اعلان کے ذریعے اسے نافذ کر دیا ۔

اس طرح میکالے کی یادداشت آئندہ برطانوی تعلیمی پالیسی کا رہنما اصول بن گئی اور اس کے نتیجے میں ہندوستان میں تعلیم کا نظام اپنی قومی اساس سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگیا ۔

نئی سرکاری پالیسی کے بعد تعلیم عامہ کمیٹی نے دھڑا دھڑ سکول قائم کرنے شروع کر دیے ۔ 1835 ء میں کمیٹی کے زیر اہتمام سکولوں کی کل تعداد اڑتالیس ہوگئی ۔ اس کے بعد ہر ضلعی صدر مقام پر سکول قائم کرنے کی پالیسی اختیار کی گئی اور 1840 ء تک ایسے چالیس سکول قائم کیے گئے ۔ یہ سکول اس قدر مقبول ہوئے کہ عربی اور سنسکرت سکولوں میں وظائف کے باوجود داخلہ لینے والوں کی تعداد نام نہاد رہ گئی جب کہ انگریزی سکولوں میں فیس کے باوجو داخلہ لینے والوں کا ہجوم ہوتا تھا ۔

1841 ء میں تعلیم عامہ کمیٹی کو ختم کرکے اس کی بجائے 1842 ء میں کونسل آف ایجوکیشن قائم کر دی گئی ۔ 1844 میں لارڈ ہرڈنگ نے واضح طور سے اعلان کر دیا کہ سرکاری ملازمت کے لیے ان افراد کو ترجیح دی جائے گی جو سرکاری سکولوں کے تعلیم یافتہ ہونگے ۔ یوں سرکاری ملازمت کا حصول تعلیم کا مقصد بن گیا ۔ ملازمتیں بہر حال محدود تھیں لہٰذا تعلیم یافتہ افراد کی بے روزگاری کا مسئلہ پیدا ہونے لگا اور دوسری طرف مقامی صنعتیں اور زرعی معیشت کارکن افراد سے محروم ہو گئیں ۔ سرکاری سکولوں کی تعداد میں اضافے کے باوجود تعلیمی ادارے آبادی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے کافی نہ تھے ۔ چنانچہ نجی سطح پر سکول

قائم کرنے کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ مشنری منتظمین اس میں پیش پیش تھے۔ یہاں تک کہ 1853ء تک خود بنگال میں مشنریوں کے قائم کردہ انگریزی سکولوں کی تعداد بائیس ہو چکی تھی۔

1835ء سے 1853ء تک کے اہم تعلیمی واقعات ایک نظر میں مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ 1836ء میں نئی طرز پر ہگلی کالج کلکتہ اور میڈیکل کالج کلکتہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔

2۔ 1844ء میں ہندو کالج کلکتہ میں انجینئرنگ کی کلاسیں شروع کی گئیں۔

3۔ 1847ء میں انجینئرنگ کالج رُڑکی قائم کیا گیا۔

تیسرا دور

برطانوی ہند میں تعلیم کا تیسرا دور 1854ء سے 1882ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ اس کا نقطہ آغاز وڈز ڈسپیچ (وڈ کا مراسلہ) ہے۔ 1853ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر پر نظر ثانی متوقع تھی۔ اس سے قبل ہاؤس آف کامنز کی ایک خاص کمیٹی نے ہندوستان میں سرکاری تعلیمی پالیسی کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اس جائزے کو کمپنی کے بورڈ آف کنٹرول کے صدر چارلز وڈ نے اپنے مشہور مراسلے کی شکل میں 1854ء میں کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کو ارسال کیا۔ آئندہ تعلیمی تبدیلیوں میں اس مراسلے کے اثرات کی وجہ سے اسے ہندوستان میں "تعلیم کا میگنا کارٹا" کہا جاتا ہے۔

وڈز ڈسپیچ میں سنسکرت اور عربی کی تعلیم کی واضح مخالفت نظر آتی ہے۔ اس کی اصل روح وہی میکالے کا نظریہ ہے جس میں مغربی علم و ادب کی بالادستی کا تصور پایا جاتا ہے۔ میکالے کی طرح اس ڈسپیچ میں بھی مشرقی علم و ادب کو غلطیوں کا مرقع قرار دیا گیا تھا۔ مقامی زبانوں کے متعلق ڈسپیچ کا لہجہ قدرے ڈپلومیٹک ہے۔ انھیں انگریزی کے ساتھ ساتھ ذریعہ تعلیم بنانے کی حمایت بھی نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میکالین انداز میں ان زبانوں کو جدید علم کے "اخذ و ترجمہ" کے معاملے میں نااہل بھی قرار دیا گیا ہے۔

ڈسپیچ کی اہم سفارشات کا خلاصہ حسب ذیل ہے ۔

1 - ہر صوبے میں محکمہ تعلیم قائم کیا جائے ۔ ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن اس محکمے کا سربراہ ہو اور اس کی معاونت کے لیے انسپکٹر متعین کیے جائیں ۔

2 - کلکتہ ، بمبئی اور مدراس کے صدر مقامات پر یونیورسٹیاں قائم کی جائیں ۔

3 - اب تک جو اعلیٰ طبقے کی تعلیم پر توجہ مرکوز رہی ہے ، آئندہ عامتہ الناس کی تعلیم پر زور دیا جائے ۔

4 - نجی کوششوں سے قائم کیے جانے والے تعلیمی اداروں کو گرانٹ دی جائے ۔

5 - انگلستان میں قائم تربیت اساتذہ کے اداروں کی طرز پر اساتذہ کی تربیت کے لیے سکول قائم کیے جائیں ۔ زیرِ تربیت اساتذہ کو وظائف دیے جائیں ۔

6 - قانون ، انجینئرنگ اور طب کے شعبوں میں بھی تربیت کا اہتمام کیا جائے ۔

7 - تعلیم نسواں کو یکساں اہمیت اور سرپرستی دی جائے ۔

ان سفارشات کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم امتحان پاس کر کے سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا عمل بن کر رہ گئی ۔ یوں اس کی اخلاقی اور تہذیبی افادیت بے حد محدود ہوگئی ۔ نیز ڈسپیچ کے نفاذ سے بہت جلد دیسی نظام تعلیم نیست و نابود ہوگیا ۔ اس اعتبار سے اس ڈسپیچ کو "غلامی کا پروانہ" بھی قرار دیا جاتا ہے ۔ اس ڈسپیچ کے ذریعے گرانٹوں کے نظام کے ذریعے نجی تعلیمی کوششوں کو بھی سرکاری کنٹرول میں لانے کی تدبیر کی گئی تھی ۔ پھر ان گرانٹوں کے متعلق عملاً جس طرح جانبداری برتی گئی اس کی وجہ سے ان کا فائدہ صرف مشنریوں ہی کو پہنچتا رہا ۔

اس تیسرے دور میں (1854ء سے 1882ء تک) جو اہم تعلیمی واقعات پیش آئے ان کا خلاصہ درج ذیل ہے ۔

1 - 1856ء میں کلکتہ میں انجینئرنگ کالج قائم کیا گیا ۔

2 - 1857ء میں کلکتہ ، مدراس اور بمبئی میں یونیورسٹیاں قائم کی گئیں ۔ نیز دیہی سکولوں کے معائنے کے لیے سرکل وار انسپکٹر آف سکولز متعین کرنے کا آغاز ہوا ۔

3 - 1864ء میں گورنمنٹ کالج لاہور قائم کیا گیا ۔

4- 1868 ء میں زمین کے لگان پر ایک فی صد کے حساب سے تعلیمی ٹیکس عائد کیا گیا ۔ اس ٹیکس کی آمدنی سے سکولوں کو ان کے نتائج (مثلاً انگریزی میں نتیجہ) کی بنا پر گرانٹ دینے کا اعلان کیا گیا ۔

5- 1869 ء میں لاہور میں یونیورسٹی کالج قائم کیا گیا ۔

6- 1878 ء میں لاہور میں پنجاب یونیورسٹی قائم کی گئی ۔

چوتھا دور

نئی تعلیم کا چوتھا دور 1882 ء سے شروع ہو کر 1904 ء پر ختم ہوتا ہے ۔ 1882 ء میں سر ولیم ہنٹر کی صدارت میں انڈین ایجوکیشن کمیشن قائم کیا گیا ۔ اس کمیشن نے سفارش کی کہ حکومت رفتہ رفتہ تعلیم کے بلاواسطہ انصرام سے ہاتھ کھینچ لے ۔ کمیشن تعلیم کے معاملے میں نجی اداروں کی حوصلہ افزائی کا حامی تھا ۔ لیکن کمیشن کی اس سفارش پر عمل نہ کیا گیا ۔ الٹا تعلیم پر حکومت کا کنٹرول بتدریج بڑھتا گیا ۔ کمیشن کے اثرات میں یہ امر بہر حال بڑا اہم ہے کہ آئندہ سرکاری تعلیمی پالیسی میں مشنریوں کو دخل اندازی کا موقع نہ دیا گیا ۔

کمیشن نے حتی الامکان ، جدید ہندوستانی زبانوں کو پرائمری اور سیکنڈری ایجوکیشن میں ذریعۂ تدریس کے طور سے استعمال کرنے کی سفارش کی لیکن عملاً اسے نافذ نہ کیا گیا ۔ کمیشن نے نصاب کے وقوفی رجحان پر بھی تنقید کی اور طلبہ کے لیے انتخاب کے مواقع فراہم کرنے کی غرض سے نصاب میں تنوع کی سفارش کی لیکن اس اصول پر بھی کبھی عمل نہ ہوا کیونکہ نصاب کے متعلق آخری اختیار یونیورسٹیوں کے ہاتھ میں تھا اور یونیورسٹیاں نصاب کے علمی انداز ہی کو درست سمجھتی تھیں ۔

چوتھے دور (1882 ء سے 1904 ء تک) کے اہم تعلیمی واقعات کا سرسری جائزہ حسب ذیل ہے ۔

1- 1886 ء میں پبلک سروس کمیشن کی سفارش پر پہلی بار انڈین ایجوکیشن سروس کا قیام عمل میں لایا گیا ۔

2 - 1887 ء میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن نے اپنی سفارشات مرتب کیں نیز الہ آباد یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا ۔

3 - 1896 ء میں حکومت ہند کے ایک ریزولیوشن کے مطابق سپیریئر ایجوکیشن سروسز کی دو شاخوں آئی ای ایس اور پی ای ایس کی تشکیل کی گئی ۔

4 - 1901 ء میں لارڈ کرزن نے شملہ میں پہلی آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس منعقد کی ۔ اسی سال پورے ہندوستان کے لیے ڈائریکٹر جنرل آف ایجوکیشن کا عہدہ قائم کیا گیا ۔

5 - انڈین یونیورسٹیز کمیشن 1902 ء نے اپنی رپورٹ پیش کی ۔

پانچواں دور

برطانوی ہند میں نئی تعلیم کا پانچواں دور 1904 ء سے شروع ہو کر 1919 ء پر ختم ہوتا ہے ۔ 1904 میں حکومت ہند نے ایک ریزولیوشن کے ذریعے نئی تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا ۔ اس پالیسی میں ثانوی تعلیم کی اصطلاح کے لیے خاص تجاویز اور گرانٹوں کی منظوری کی شرائط شامل تھیں ۔

1904 ء تک حرفتی تعلیم کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں تھا ۔ 1904 ء کے ریزولیوشن میں حرفتی تعلیم کے لیے مضبوط اساس کی فراہمی پر زور دیا گیا لیکن عملاً صورت حال میں کوئی اصلاح نہ ہوئی ۔

مادری زبان کی تدریس کے متعلق اس ریزولیوشن میں بڑی واضح پالیسی تجویز کی گئی تھی ۔ طے کیا گیا کہ اصولاً کسی بھی طالب علم کو اس وقت تک انگریزی زبان سیکھنے کی اجازت نہ دی جائے جب تک کہ وہ تعلیم کی ابتدائی مدارج میں خاطر خواہ ترقی نہ کر لے اور اپنی مادری زبان میں مکمل مہارت حاصل ہونے کے بعد بھی اسے قبل از وقت دوسرے مضامین کا ذریعہ تدریس نہ بنایا جائے ۔ انگریزی ذریعۂ تدریس کے استعمال کے لیے کم از کم عمر 13 سال مقرر کی گئی اور ثانوی تعلیم کے پورے دورانیے میں مادری زبان کو لازمی مضمون کی حیثیت سے جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا ۔ صرف پنجاب کا صوبہ ایسا تھا جہاں آٹھویں جماعت

کے بعد اردو کو لازمی مضمون کے طور سے شامل نصاب نہ کیا گیا۔

پانچویں دور کے اس عرصے میں حکومت ہند کا 1913ء کا ریزولیوشن منظر عام پر آیا۔ اس ریزولیوشن میں پہلی بار نصاب پر امتحان کی بالادستی کی مخالفت کی گئی اور اس امر پر زور دیا گیا کہ امتحانوں کو محض "داخلہ ٹیسٹ" نہیں ہونا چاہیے بلکہ ان کی نوعیت ایسی ہونی چاہیے کہ "صلاحیت کی تلاش" کا مقصد حاصل ہو سکے۔

پانچویں دور (1904ء سے 1919ء تک) کے عرصے میں اہم تعلیمی واقعات کا سرسری خاکہ درج ذیل ہے۔

1- 1905ء میں قومی تعلیم کی مفصّل منصوبہ بندی کے لیے نیشنل کونسل آف ایجوکیشن قائم کی گئی۔

2- اب تک تعلیم محکمہ داخلہ کے ساتھ منسلک تھی۔ 1909ء میں اسے محکمہ تعلیم و صحت و اراضی میں شامل کر دیا گیا اور ڈائریکٹر جنرل تعلیمات کا عہدہ ختم کر دیا گیا۔

3- 1911ء میں تعلیمی ترقی کے لیے 90 لاکھ روپے کو خصوصی غیر مکرر گرانٹ دی گئی۔ اسی سال 11 دسمبر کو تاجپوشی دربار میں 50 لاکھ روپے کی مکرر گرانٹ کا اعلان کیا گیا۔

4- 1915ء میں ایک ایکٹ کے ذریعے بنارس یونیورسٹی وجود میں لائی گئی۔

5- 1916ء میں پٹنہ میں خواتین یونیورسٹی قائم کی گئی۔

6- 1917ء میں رنگون یونیورسٹی قائم کی گئی۔

چھٹا دور

ہندوستان میں نئی تعلیم کا چھٹا دور 1919ء سے 1929ء تک ہے۔ کلکتہ

یونیورسٹی کمیشن یا سیڈلر کمیشن 1917 ء میں قائم کیا گیا تھا ۔ اس نے اپنی رپورٹ 1919 ء میں پیش کی ۔ کمیشن نے اپنی سفارشات میں تجویز پیش کی کہ گیارھویں بارھویں جماعت کو یونیورسٹیوں سے علیحدہ کر دیا جائے ۔ یہ سفارش بیشتر صوبوں نے منظور کر لی لیکن پنجاب میں اس کے عمل درآمد کی رفتار بڑی سست رہی ۔

چھٹے دور کے اہم تعلیمی واقعات ایک نظر میں حسب ذیل ہیں ۔

1 – 1919 ء میں ہندوستان میں برطانوی اصلاحات کے خلاف تحریک عدم تعاون شروع کی گئی اور اس سلسلے میں منتخب مقامات پر قومی سکول اور قومی یونیورسٹیاں قائم کی گئیں ۔

2 – 1920 ء میں لکھنؤ یونیورسٹی قائم کی گئی ۔

3 – اہم تعلیمی امور پر ماہرانہ رائے دہی کے لیے 1921 ء میں سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کی تشکیل کی گئی ۔

4 – 1922 ء میں ناگپور یونیورسٹی اور دہلی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا ۔

5 – 1923 ء میں میونسپلٹیوں میں ابتدائی تعلیم (6 سے 11 سال کی عمر تک) لازمی قرار دی گئی اور ان اخراجات کو پورا کرنے کے لیے میونسپلٹیوں کو تعلیمی ٹیکس لگانے کا اختیار دیا گیا ۔

6 – 1925 ء میں انٹر یونیورسٹی بورڈ قائم کیا گیا ۔

ساتواں دور

برطانوی ہند میں تعلیمی تبدیلیوں کا ساتواں دور 1929 ء سے شروع ہو کر 1947 ء میں قیام پاکستان پر ختم ہوتا ہے ۔ 1929 ء میں انڈین سٹیچوٹری کمیشن کی معاون کمیٹی نے پہلی بار ہندوستان کے پورے نظام تعلیم کا جائزہ لیا ۔ اس کمیٹی کی سفارشات میں ابتدائی تعلیم کی مضبوط اساس پر نظام تعلیم کی تشکیل نو پر زور دیا گیا تھا ۔ کمیٹی نے

حرفتی مضامین اور عام مضامین کے الگ الگ امتحانات کے نظام کی مخالفت کی ۔

ہندوستان میں اس وقت جو صورت حال تھی اس کی وجہ سے انڈین سٹیچوٹری کمیشن کا بائیکاٹ کیا گیا ۔ 1938 ء اور پھر 1939 ء میں آٹھویں جماعت تک کی مفت لازمی عمومی تعلیم کے جائزے کے لیے ذاکر حسین کمیٹی تشکیل دی گئی ۔ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں ناخواندگی کے خاتمے کے لیے سفارشات پیش کیں ۔ 1944 ء میں سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن نے اپنی رپورٹ میں ان سفارشات کو بھی شامل کرلیا تھا ۔ ابتدائی تعلیم کی اصلاح کے علاوہ بورڈ نے دو رووں پر مشتمل ثانوی تعلیم کی قومی سکیم پیش کی ۔ ایک رو 14 سال تک کی عمر کے تمام طلبہ کے لیے تھی جسے اکیڈمک ہائی سکول کے ذریعے نافذ کیا جاتا تھا ۔ دوسری رو ایسے طلبہ کے لیے تھی جو اوسط سے زیادہ صلاحیت رکھتے تھے ۔ اس رو کا نفاذ ٹیکنیکل ہائی سکول کے ذریعے تجویز کیا گیا تھا ۔ بورڈ نے سفارش کی تھی کہ ہائی سکولوں کے جونیئر سیکشن (آٹھویں جماعت تک) میں انسانیات پر مشتمل لازمی مضامین پر مشتمل نصاب نافذ کیا جائے جب کہ سینئر سیکشن (نویں سے بارھویں تک) میں متنوع نصاب نافذ کیا جائے ۔

ایڈوائزری بورڈ نے مادری زبان کو ذریعۂ تدریس کے طور سے اختیار کرنے کی سفارش کی ۔ لیکن عملاً انگریزی 1949 ء تک ریاضی اور سائنس کے مضامین کے ذریعۂ تدریس کے طور پر سے بھی جاری رہی ۔

ساتویں دور میں (1929 ء سے 1947 ء تک) درج ذیل اہم تعلیمی واقعات پیش آئے ۔

1 ۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 ء کے مطابق مکمل صوبائی خود مختاری کا اصول نافذ کیا گیا اور وزیر تعلیم کے اختیارات بڑھا دیے گئے ۔

2 ۔ 1936 ء میں انگلستان کے ٹیکنیکل سکول بورڈ آف ایجوکیشن کے سابق چیف انسپکٹر مسٹر ہربرٹ اور بورڈ آف ایجوکیشن کے سابق ڈائریکٹر انٹیلی جنس مسٹر ایس ایچ وڈ نے ہندوستان کا دورہ کرکے تعلیم کی اصلاح کے لیے سفارشات پیش کیں ۔

3 - 1945ء میں ٹیکنیکل تعلیم کی آل انڈیا کونسل تشکیل کی گئی ۔ اسی سال مرکزی حکومت میں تعلیم کا الگ محکمہ قائم کیا گیا ۔

نظامِ تعلیم کی خصوصیات

برطانوی ہند میں تعلیم کے ارتقا کا جو مفصل جائزہ اوپر پیش کیا گیا ہے ، اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ نظام اپنی اساس اور اصول کے اعتبار سے دیسی نظام تعلیم خصوصاً مسلمانوں کی تعلیمی میراث کے خلاف تھا ۔ 1882ء تک تو اس پر عیسائی مشنری سرگرمیوں کی چھاپ بالکل نمایاں تھی ۔ اس کے بعد حکومت نے خود اپنی سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے تعلیم میں مشنریوں کی براہ راست شرکت کو پسند نہ کیا لیکن سرکاری تعلیمی پالیسیوں میں بہر حال مغربی علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کی ترویج ہی کو مرکزی حیثیت حاصل رہی اور یوں بالواسطہ عیسائیت کی تبلیغ کے لیے راہ ہموار کرنے میں نئی تعلیم نمایاں کردار ادا کرتی رہی ۔ بعض حکام اور بعض حکومتی پالیسیوں اور اعلانات میں دیسی زبانوں کے متعلق ہمدردانہ رویے کی بعض مثالیں بھی ملتی ہیں ۔ لیکن ان کی حیثیت نقار خانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ نہ تھی ۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ بھارت کی آزادی اور پاکستان کے قیام کے مرحلے تک پہنچتے پہنچتے نظام تعلیم اپنی دیسی اساس سے بالکل کٹ گیا ۔ چنانچہ 1947ء میں قیام پاکستان کے موقع پر ہمیں جو نظام تعلیم ورثے میں ملا وہ اپنے رنگ روپ کے اعتبار سے اسلام کے تعلیمی تصورات سے بالکل مختلف تھا ۔ ذیل میں اس نظام تعلیم کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے ۔

مقاصد تعلیم

اس نظام تعلیم کے مقاصد میں استعمارانہ عزائم کی جھلک صاف نمایاں ہے ۔ انگریز فاتح کی حیثیت سے ہندوستان آئے تھے ۔ اور لندن میں بیٹھ کر ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتے تھے ۔ انھوں نے ہندوستانیوں کو ہمیشہ محکوم سمجھا اور ان کے لیے ایسا نظام تعلیم تیار کیا جو انھیں غلامی میں پختہ کار بنا دے ۔ اس کی ایک واضح شہادت یہ ہے کہ انگریزوں نے

ہندوستان میں جو نظام تعلیم نافذ کیا وہ اس نظام سے قطعی مختلف تھا، جو اس دور میں خود انگلستان میں نافذ تھا۔ ہندوستان میں انگریزی نظام تعلیم کے مقاصد حسب ذیل تھے۔

1۔ ملازمین سرکار کی فراہمی

حکومت برطانیہ کو ہندوستان میں اپنا نظم و نسق چلانے کے لیے اہلکاروں کی ضرورت تھی۔ کلیدی آسامیوں کے لیے تو افسران برطانیہ ہی سے آئے تھے۔ لیکن عام "بابو طبقہ" کی فراہمی بہر حال مقامی سطح پر درکار تھی۔ اس بابو طبقے کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ سرکار کا "وفادار" ہو یا میکالے کے الفاظ میں "نسلاً ہندوستانی مگر مزاجاً انگریز" ہو۔

2۔ عیسائیت کی تبلیغ

ابتدا میں تعلیمی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مقصد ہی عیسائیت کی تبلیغ تھا۔ اس مقصد کے لیے ہندوؤں اور خصوصاً نیچ ذات کے ہندوؤں کو خاص طور سے توجہ کا مرکز بنایا جاتا تھا۔ جب سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے تبلیغ عیسائیت کو سرکاری سطح پر نظام تعلیم کا حصہ بنانے سے گریز کی پالیسی اپنائی گئی تو بھی نجی تعلیمی اداروں میں سرکاری گرانٹ بالعموم مشنری اداروں ہی کو دی جاتی رہی۔ دراصل حکومت عیسائیوں کی تھی لہٰذا بالواسطہ سرکاری تعلیمی نظام بہر حال عیسائیت کے فروغ کا ذریعہ بن رہا تھا۔

3۔ مغربی تہذیب و ثقافت کی ترویج

دراصل پہلے اور دوسرے مقصد کے حصول کا بھی ایک بہت بڑا موثر ذریعہ یہ تھا کہ اہل ہند کو ان کی اپنی تہذیت و ثقافت سے کاٹ دیا جائے اور اس کی بجائے مغربی تہذیب و ثقافت کا دلدادہ بنا دیا جائے تاکہ وہ مغربی انداز اختیار کر لیں اور انگریزوں کو غاصب اور ظالم سمجھنے کی بجائے اپنا محسن سمجھنے لگیں۔

4۔ مغربی علم کی ترویج

1813ء کے چارٹر سے لے کر آخر تک مغربی علم و ادب اور فلسفہ و سائنس کو

برطانوی تعلیمی پالیسیوں میں مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ خالص علمی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی ہرج نہ تھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ علمی اعتبار سے برصغیر ان علوم میں کبھی کوئی نمایاں خدمت انجام نہ دے سکا۔ تاریخ شاہد ہے ہندوستان کا مغربی نظام تعلیم اپنے ڈیڑھ سو سال کے طویل عرصے میں کوئی ایک بھی قابل ذکر سائنسدان، فلسفی یا ادیب پیدا نہ کر سکا۔

نصابِ تعلیم

ان مقاصد کے حصول کے لیے سب سے بڑا اقدام یہ کیا گیا کہ متوازی دیسی نظام کو غیر موثر بنانے کے لیے سرکاری ملازمتوں کو نئے سرکاری یا سرکار کے منظور کردہ تعلیمی اداروں کے فارغ التحصیل افراد کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ نیز سرکاری اور منظور شدہ تعلیمی اداروں کا نصاب سرکار کی طرف سے متعین کر دیا گیا اور اس نصاب میں انگریزی زبان و ادب اور مغربی علوم و فنون کو شامل کیا گیا۔ مشنری اداروں میں تو مسیحیت کی تعلیم لازمی تھی۔ یہ ادارے عام طور سے گرجاسے متصل ہوتے تھے۔ سکول یا کالج میں صلیب نمایاں مقام پر نصب ہوتی تھی۔ اساتذہ پادری ہوتے تھے، جو مخصوص لباس میں آتے تھے۔ غرض کوشش کی جاتی تھی کہ تعلیمی ادارے کا پورا ماحول مسیحی ہو۔ تعلیم میں سیکولر پالیسی سے حکومت کی مراد صرف یہ تھی کہ مسیحیت کے سوا کسی دوسرے مذہب یعنی اسلام، ہندومت یا بدھ مت کو نظام تعلیم میں کوئی دخل حاصل نہ ہو۔ جہاں تک عیسائیت کا تعلق ہے نصاب سے سرکاری طور پر انجیل کے اخراج کے باوجود بھی تعلیمی اداروں کا ماحول بہر حال عیسائیت پسندانہ ہی ہوتا تھا۔

انگریزی زبان

برطانوی نظام تعلیم کے تحت ہندوستان کے تعلیمی اداروں کے نصاب میں انگریزی زبان و ادب کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ تیسری جماعت سے بی اے تک انگریزی کو لازمی زبان کی حیثیت حاصل تھی۔ نظام اوقات میں سب سے زیادہ وقت انگریزی کی تدریس کے لیے مختص کیا جاتا تھا۔ انگریزی کے استاد کو سب سے زیادہ پروقار مقام حاصل

تھا ۔ دیگر ملازمتیں بھی صرف انگریزی جاننے والوں کو ملتی تھیں ۔ پورے تعلیمی دور میں انگریزی ذہنوں پر مسلّط رہتی تھی ۔

تاریخ

اہل ہند کو سیاسی غلامی پر مطمئن کرنے کے لیے تاریخ کا مضمون شامل نصاب کیا گیا ۔ تاریخ نویسی کو محض واقعات کے بیان تک محدود نہ رکھا گیا بلکہ اس کی تشریح انگریزوں کے نقطۂ نظر سے کی گئی ۔ یورپ اور انگلستان کی تاریخ طلبہ کو اس طرح پڑھائی جاتی تھی کہ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو کر انگریزوں ہی کو حکومت کا مستحق سمجھنے لگیں ۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے دور حکومت کی تاریخ بھی انگریزوں کے نقطۂ نظر سے مرتب کر کے پڑھائی جاتی تھی ۔ مسلمان بادشاہوں کی خامیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس طرح پیش کی گئیں کہ پڑھنے والے کو ان سے نفرت ہونے لگے ۔ خاص طور سے ہندوؤں کو مسلمان حکمرانوں سے متنفر کرنے کے لیے واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ۔

معاشیات

معاشیات ایک بامقصد علم ہے لیکن اس کے نصاب کو اس طرح مرتب کیا گیا کہ انسان معاشی حیوان سے زیادہ کچھ نظر نہیں آتا ۔ مغربی معاشی تصورات کے مطابق انسان انتہائی خود غرض ہے اور ہر وقت مادی فائدے کے درپے ہے ۔ اس میں حلال و حرام کی تمیز کا کوئی سوال نہیں ۔ رشوت ، سود ، ذخیرہ اندوزی سب منافع بخش اعمال ہیں ۔ ان کی اخلاقی قباحت یا شرعی حرمت کا کوئی تصور مطالعے میں نہیں آتا ۔ اور دوسروں کے لیے ایثار یا صدقہ و خیرات کی تو سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی ۔ ظاہر ہے کہ معاشیات کا یہ نصاب اسلامی تصورِ حیات سے براہ راست متصادم تھا ۔

پولیٹیکل سائنس

پولیٹیکل سائنس کا لوازمہ نصاب بھی اسلام کے تصورات سے متصادم تھا ۔ جمہوریت

کے مغربی تصور میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کے نظریے کی کوئی گنجائش نہ تھی ۔ عوام کی حاکمیت کا تصور سراسر الحادی تصور تھا ۔ یوں نصاب کا یہ حصہ بھی مغربی الحاد کو فروغ دینے کا باعث بن رہا تھا ۔

سائنس

سائنس کا نصاب بھی الحاد پسندانہ تھا ۔ اس سے طلبہ میں ایجاد و اختراع کی کوئی صلاحیت تو پیدا نہ ہوتی تھی الٹا وہ کائنات کی تخلیق و انتظام کے متعلق اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا ہو جاتے تھے ۔ عربی ، فارسی اور مذہب کو نصاب سے بالکل خارج کر دیا گیا اور یوں اہل ہند کو بالعموم اور ہندی مسلمانوں کو بالخصوص ان کے کلچر سے کاٹ دیا گیا ۔ اردو کو بھی صرف پرائمری مدارج کے نصاب تک محدود کر دیا گیا ۔

نظامِ تعلیم

نظامِ امتحان

انگریزوں کے تسلّط سے قبل برصغیر میں مسلمانوں نے جو نظام تعلیم رائج کیا تھا ، اس میں علم و فن کی ترقی سے بڑھ کر تعمیر کردار اور تزکیہ نفس کو اہمیت حاصل تھی ۔ اس نظام میں استاد کو مرکزی مقام حاصل تھا ۔ وہ علم و کردار کا اعلیٰ نمونہ طلبہ کے سامنے پیش کرتا تھا ۔ اور ان کی علمی نشوونما کے ساتھ ساتھ ان کے کردار کی تربیت بھی کرتا تھا ۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے نظام میں طالب علم کے اکتساب کا جائزہ بھی صحیح معنوں میں استاد ہی لے سکتا ہے ۔ کوئی دوسرا شخص یا ادارہ زبانی یا تحریری آزمائش کے ذریعے زیادہ سے زیادہ علمی اکتساب کے بعض پہلوؤں کا جائزہ لے لے گا ۔ لیکن کردار کے تربیتی پہلو کا جائزہ بہر حال استاد ہی لے سکے گا ۔ انگریزوں نے استاد کو محض ایک ملازم بنا کے رکھ دیا تھا ۔ اسے اس اعتماد کا اہل نہ سمجھا گیا کہ اس کی رائے سے طالب علم کے اکتساب کا معیار مقرر کیا جائے ۔ اس کی بجائے تحریری امتحانات کا ایک ایسا نظام رائج کیا گیا جس میں استاد کو کوئی حیثیت حاصل نہ تھی ۔ ان امتحانات کے نتائج پر طلبہ کے پاس فیل ہونے کا فیصلہ کیا جاتا تھا ۔ اور پاس

ہونے والوں کے لیے درجہ اول ، درجہ دوم یا سوم کا تعین کیا جاتا تھا ۔ رفتہ رفتہ ان امتحانوں میں بد عنوانیوں کا عمل دخل جس طرح بڑھتا گیا اس سے قطع نظر ، ان کی فطرت میں خرابی کی یہ صورت مضمر تھی کہ اس میں نصاب امتحان کے تابع مہمل کی حیثیت اختیار کر گیا ۔ نصاب کا مقصود تو بہر حال معلومات و تصورات یاد کر لینے سے بڑھ کر ان کا علمی اطلاق اور رویوں کی تشکیل تھا ۔ اس کی جانچ کا اس نظام امتحان میں کوئی انتظام ہی نہ تھا ۔ پھر نصاب میں شامل کوئی مضمون یا اس مضمون کا کوئی حصہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو اگر امتحانی ادارہ اپنے پرچوں میں اسے نظر انداز کرتا جائے تو اس کی تدریس بالکل غیر مؤثر ہو جاتی ہے ۔ مثلاً ایک دور آیا کہ نصاب میں جسمانی تربیت کا اضافہ کر دیا گیا لیکن چونکہ امتحان کے نظام میں اسے کوئی اہمیت حاصل نہ ہو سکی لہٰذا عملی تدریس کے اعتبار سے اس کی حیثیت برائے نام رہی ۔

مشقی سوالات

1 - برطانوی ہند میں میکالے کی یادداشت کی اہمیت بیان کیجیے ۔

2 - وڈز ڈسپیچ ہندوستان میں "تعلیم کے میگنا کارٹا" کی حیثیت رکھتی ہے ۔ بحث کیجیے ۔

3 - وڈز ڈسپیچ اہل ہند کے لیے "غلامی کے پروانے" کی حیثیت، رکھتی ہے ۔ بحث کیجیے ۔

4 - انڈین ایجوکیشن کمیشن 1882ء کی سفارشات کا خلاصہ بیان کیجیے اور ان کی اہمیت پر نوٹ لکھیے ۔

5 - حکوت ہند کے ریزولیوشن 1904ء ، 1913ء کی تعلیمی اہمیت پر بحث کیجیے ۔

6 - 1919ء سے 1947ء تک کے عرصے میں برطانوی ہند میں تعلیمی پالیسیاں کاغذی کاروائی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں ۔ بحث کیجیے ۔

7 - 1813ء کے چارٹر ایکٹ کی تعلیمی اہمیت بیان کیجیے ۔

8 - برطانوی ہند میں تعلیم کی بنیادوں اور مقاصد کی نشاندہی کیجیے ۔

9- انڈین سٹیچوٹری کمیشن 1929 ء کی معاون کمیٹی کی تعلیمی سفارشات کی نشاندہی کیجیے ۔

10- برطانوی ہند کے نظامِ تعلیم میں انگریزی کے مقام پر مختصر نوٹ لکھیے ۔

11- برطانوی ہند کے نصاب تعلیم میں سائنس اور تاریخ کے مقام کی وضاحت کیجیے ۔

12- برطانوی ہند کے نصاب میں اردو کی کیا حیثیت تھی ؟

13- برطانوی ہند کے نصاب میں عربی ، فارسی اور اسلامیات کا کیا مقام تھا ؟

14- درج ذیل بیانات صحیح ہیں یا غلط ۔

- چارلز گرانٹ کو جدید ہندوستان کا بابائے تعلیم کہا جاتا ہے ۔ ص غ
- چارٹر ایکٹ 1813 ء میں پہلی بار تعلیم کے لیے دس لاکھ روپے کی رقم مختص کی گئی ۔ ص غ
- 1830 ء میں کمپنی نے ابتدائی تعلیم کے فروغ کی کوشش پر مدراس کے گورنر کی بڑی تعریف کی ۔ ص غ
- گورنمنٹ کالج کلکتہ ہندوستان کا پہلا گورنمنٹ کالج تھا ۔ ص غ
- میکالے گورنر جنرل ہند کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن تھا ۔ ص غ
- میکالے تعلیم عامہ کمیٹی کا صدر تھا ۔ ص غ
- انگریزی کی تعلیم کے مسئلے پر میکالے اور لارڈ بینٹنگ میں شدید اختلاف تھے ۔ ص غ
- وڈز ڈسپیچ میں تعلیم نسواں کی اہمیت پر زور دیا گیا تھا ۔ ص غ
- وڈز ڈسپیچ میں اعلیٰ طبقے کی تعلیم کی بجائے عامتہ الناس کی تعلیم کا تصور پیش کیا ۔ ص غ
- وڈز ڈسپیچ کے نفاذ کی وجہ سے دیسی نظام تعلیم ختم ہو گیا ۔ ص غ
- 1880 ء تک گرانٹیں صرف مشنری تعلیمی اداروں کو دی جاتی تھیں ۔ ص غ
- انڈین ایجوکیشن کمیشن 1882 ء نے گرانٹوں پر

مشنری تعلیمی اداروں کی اجارہ داری کی سفارش کی ۔ ص غ

۔ انڈین ایجوکیشن کمیشن نے جدید ہندوستانی زبانوں کو پرائمری اور سیکنڈری تعلیم میں ذریعۂ تدریس بنانے کی سفارش کی ۔ ص غ

۔ حکومت ہند کے ریزولیوشن 1904 ء میں ہر سطح پر انگریزی کو ذریعۂ تدریس بنانے کا فیصلہ کیا گیا ۔ ص غ

۔ سنٹرل ایڈوائزری بورڈ 1944 ء نے اوسط سے بالا طلبہ کے خاص اکیڈمک ہائی سکول قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی ۔ ص غ

۔ سنٹرل ایڈوائزری بورڈ 1944 ء نے مادری زبان کو ذریعۂ تدریس بنانے کی سفارش کی تھی ۔ ص غ

15 - درج ذیل بیانات میں خالی جگھوں کو پُر کیجیے ۔

۔ 1833 ء کے چارٹر ایکٹ میں تعلیم کے لیے ---- روپے کی رقم مختص کی گئی ۔

۔ 1841 ء میں تعلیم عامہ کمیٹی ختم کر کے 1842 ء میں ---- قائم کر دی گئی ۔

۔ وڈز ڈسپیچ میں تعلیمی نظم و نسق کے لیے ہر صوبے میں ---- کا عہدہ قائم کرنے کی سفارش کی گئی ۔

۔ تربیت اساتذہ کے انتظام کی سفارش پہلی بار ---- میں کی گئی ۔

۔ وڈز ڈسپیچ ---- کا پروانہ بھی کہا جاتا ہے ۔

۔ سرکل وار انسپکٹر آف سکولز متعین کرنے کا آغاز سن ---- میں ہوا ۔

۔ 1902 ء میں ---- کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کی ۔

۔ 1905 ء میں قومی تعلیم کی مفصل منصوبہ بندی کے لیے ----

۔ 1909 ء میں تعلیم کو وزارت داخلہ سے الگ کر کے وزارت ---- میں شامل کر دیا گیا ۔

۔ سنٹر ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن 1944 ء نے دو قسم کے ہائی سکولوں کی تجویز پیش کی تھی ایک ٹیکنیکل سکول ، دوسرے ---- ۔

باب 3

جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریکات

پس منظر

قیام پاکستان کی تاریخ کو فقط سیاسی کشمکش کی داستان قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ غور کیا جائے تو اس سلسلے کی ہر سیاسی تحریک کے پس منظر میں کوئی فکری ، نظری اور مذہبی تحریک کار فرما نظر آتی ہے ۔

1857ء کے بعد مسلمان آزادی کے حصول کی مسلسل کوشش کرتے رہے ۔ اس سلسلے میں جنگ پلاسی ، میسور کی لڑائیاں ، احمد شاہ ابدالی کا حملہ اور سید احمد شہید کا جہاد خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

اٹھارویں صدی کے اسی دور میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمی تحریک پوری قوت سے مسلمانوں میں دینی ، اخلاقی اور سیاسی انقلاب کے لیے اہم کردار ادا کر رہی تھی ۔ کیونکہ بعد کی تمام تعلیمی تحریکات کے قائدین بلاواسطہ یا بالواسطہ اسی تحریک کے فیض یافتہ تھے ۔

شاہ ولی اللہؒ نے جب تعلیمی تحریک کا آغاز کیا اس وقت مسلمانوں کا اقتدار (برائے نام سہی) ہندوستان پر قائم تھا اور مسلمانوں کا نظام تعلیم عملی طور پر رائج تھا ۔ لیکن **1857**ء کے بعد صورت حال بالکل بدل گئی ۔ اب انگریز مکمل طور پر ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے ۔ انگریزوں نے مسلمانوں کا نظام تعلیم منسوخ کر کے انگریزی نظام تعلیم نافذ کر دیا تھا ۔ سرکاری ملازمتیں صرف نئے نظام تعلیم سے سند یافتہ لوگوں کو مل سکتی تھیں ۔ ہندوؤں نے اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا ۔ وہ انگریزی تعلیم حاصل کر کے سرکاری

ملازمتوں کے ذریعے زندگی کے ہر میدان میں مسلمانوں پر برتری حاصل کرتے جا رہے تھے۔ اس صورت حال سے اہل بصیرت مسلمان بجا طور پر پریشان تھے۔ ان میں سے ایک طبقے کی واضح رائے یہ تھی کہ مسلمانوں کو حالات سے سمجھوتہ کر کے معاشرے میں آگے بڑھنے کے لیے انگریزی نظام تعلیم سے استفادہ کرنا چاہیے۔ لیکن مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اب بھی اسلام کے علمی ورثے کو سرمایہ حیات سمجھتا تھا۔ یہ لوگ اسلامی علوم کے ورثے کی بقا میں ہی دین و دنیا کی فلاح سمجھتے تھے۔ دونوں مکاتب فکر میں ایک بات مشترک تھی۔ اور وہ یہ کہ دونوں برصغیر میں مسلمانوں کے استقلال اور عروج کو نصب العین سمجھتے تھے۔

یہ دو بڑے مکتب فکر تحریک علی گڑھ اور تحریک دیوبند کے نام سے موسوم ہوئے لیکن مسلمان لیڈر ان تعلیمی تحریکوں کے نتائج سے پورے مطمئن نہ ہو سکے اور مسلمانوں کو ایک متوازن نظام تعلیم مہیا کرنے کے لیے ندوۃ العلما اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تعلیمی تحریکیں شروع ہوئیں۔

یہ چاروں علمی تحریکیں برصغیر کی سیاسی زندگی پر اہم اثر ڈالتی ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد بھی ان تحریکوں کے اثرات کسی نہ کسی طرح جاری ہیں۔ خصوصاً نظام تعلیم کی تشکیل نو میں ان کے اپنے اپنے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان تحریکوں کا مفصل جائزہ ذیل میں پیش کیا گیا ہے۔

تحریکِ دیو بند

پس منظر

ہندوستان میں اقتدار کی تبدیلی کے بعد انگریزوں نے جب نیا نظام تعلیم نافذ کیا تو ہندوؤں نے فوراً ہی نئی صورت حال کو قبول کر لیا کیونکہ اس سے انھیں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ پہلے وہ مادی مفاد کے لیے عربی اور فارسی پڑھتے تھے۔ اب اسی مقصد کے حصول کے لیے انگریزی کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ مسلمانوں کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ وہ نئی صورت حال کو اپنی علمی اور تہذیبی روایت کے لیے خطرناک سمجھتے تھے۔ ان کو خطرہ

تھا کہ نئی تعلیم مسلمانوں کو بے دینی اور مغرب پرستی کی طرف لے جائے گی ۔ اس صورت حال میں دینی علوم کے تحفظ کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا جا رہا تھا تاکہ مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کی صحیح اسلامی خطوط پر تعلیم و تربیّت کی جا سکے اور ان کو مغرب پرستی اور بے دینی کے یلغار کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کیا جا سکے ۔ اس سلسلے میں لائحہ عمل کے انتخاب کے لیے سہارن پور (یو پی انڈیا) کے قصبہ دیوبند کی قدیم مسجد چھتہ سوچ بچار اور مشاورت کا مرکز بن گئی ۔ جہاں مولانا محمد قاسم نانوتوی اپنے ساتھی علماء کے ساتھ عموماً مقیم رہتے تھے ۔ آخر 30 مئی ، 1866ء کو مولانا نانوتوی نے سہارن پور (یو پی) کے اس غیر معروف قصبے دیوبند میں دارالعلوم کا آغاز کیا ۔ مولانا نانوتوی مولوی مملوک علی کے شاگرد تھے ۔ مولانا مملوک علی شاہ ولی اللہ کے تعلیمی مکتب فکر کے پروردہ تھے اور سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین میں شامل رہے تھے ۔ اس طرح تحریک دیوبند خاندان ولی اللہ کے چشمہ فیض ہی کا تسلسل ہے ۔ دارالعلوم کے پہلے سربراہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور اولین شاگرد مولانا محمود الحسن تھے ۔

دارالعلوم حکومت سے مکمل لاتعلقی کے بنیادی اصول پر قائم ہوا ۔ بانیء دیوبند نے اس کی بے سروسامانی کو توکل اور رجوع الی اللہ کا سبب قرار دیا ۔ مستقل ذرائع آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے عام مسلمانوں سے رابطہ قائم کیا گیا ۔ جس سے دارالعلوم کا تعارف دُور دُور تک پھیلا اور اس کے ہمدردوں میں اضافہ ہوا اور جلد ہی اس ادارے نے ایک عظیم جامعہ کا مقام حاصل کر لیا ۔ جس میں برصغیر کے علاوہ بیرون ملک سے بھی کثیر تعداد میں طلبہ تحصیل علم کے لیے حاضر ہوتے تھے ۔

تحریکِ دیوبند کے اسباب

مندرجہ ذیل اسباب و واقعات تحریک دیوبند کے محرکات ثابت ہوئے ۔

1 - احیائے دین

برصغیر میں مسلمانوں کی دینی اور اجتماعی زندگی کی اصلاح ، بدعات کے خاتمے اور اصلاح

اخلاق کے لیے مختلف تحریکیں برپا ہوئیں ۔ ان کا بنیادی محرک احیائے دین اور دینی علوم کی اشاعت و تحفظ کا جذبہ تھا ۔

2- تبلیغ اسلام

عیسائی پادری اور مشنری ادارے کھلم کھلا عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت سرکاری سرپرستی میں کر رہے تھے ۔ اس صورت حال میں ایسے علماء کی تیاری بہت ضروری تھی جو تبلیغ اسلام اور عیسائیت کی تردید کا فریضہ انجام دے سکیں ۔ تحریک دیوبند نے یہ فریضہ بطریق احسن انجام دیا ۔

3- نصابِ تعلیم

اس وقت اسلامی مدارس میں عام طور پر "درس نظامی" رائج تھا ۔ شاہ ولی اللہ کی فکر سے متاثر علماء نے قرآنی علوم اور علم حدیث کو اولیت دی ۔ چنانچہ ان کے زیر اثر صحاح ستہ (حدیث کی چھ مستند کتابیں) کو نصاب میں شامل کیا گیا اور عربی ادب کے علاوہ تاریخ کو بھی نصاب میں مناسب مقام دیا گیا ۔

دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں صرف و نحو ، عربی ادب ، تفسیر و حدیث ، فلسفہ ، علم کلام اور منطق ، اصول فقہ ، معانی و بیان ، عقائد و کلام ، فنون عصر ، تجوید اور خوش نویسی کے مضامین شامل تھے ۔ ان علوم و فنون کی تکمیل کے لیے مختلف کتب کا مطالعہ کرایا جاتا تھا ۔ دارالعلوم کا یہ نصاب ابتدائی ، متوسط ، اعلٰی اور تکمیل کے چار طبقات پر مشتمل تھا ۔ اس نصاب کی تکمیل بالعموم نو سالوں میں مکمل ہوتی تھی ۔

تحریکِ دیوبند کی خصوصیات

یہ عظیم علمی تحریک مندرجہ ذیل خصوصیات کی وجہ سے ایک امتیازی شان کی حامل ہے ۔

1- برصغیر کی مختلف تعلیمی روایات میں توازن

برصغیر کے معروف تعلیمی مراکز نے معقولات ، منقولات اور علم کلام کے مختلف رجحانات کے باعث اپنا اپنا خصوصی تشخص قائم کر رکھا تھا ۔ دیوبند میں علم کے ان تینوں پہلوؤں میں توازن قائم کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ، جس سے دیوبند برصغیر میں مسلمانوں کی مجموعی تعلیمی روایت کا نمائندہ بن گیا ۔

2- دینی تعلیم کا تحفظ

دیو بند کے قیام کا بنیادی مقصد دینی علوم کا تحفظ تھا ۔ دارالعلوم نے یہ خدمت بطریق احسن انجام دی اور بہت جلد یہ ادارہ دنیائے اسلام میں دینی علوم کی ترویج و اشاعت کا مرکز بن گیا ۔ یہاں سے ہزاروں علماء اور طلبا فارغ التحصیل ہو کر نکلے جنھوں نے اسلامی علوم کی ترویج کے چراغ روشن کرتے ہوئے بے دینی کی یلغار کے آگے بند باندھا اور بدعات کو ختم کیا ۔

3- عملی فنون کی تعلیم

دیوبند میں مختلف فنون کی تربیت کا آغاز ہوا ۔ جس میں طب کی تعلیم خاص طور پر اہم ہے ۔ اس کے علاوہ خطاطی ، جلد سازی اور کپڑا بننے کی مہارتوں کی ابتدائی تعلیم پر توجہ دی گئی ، جس سے دارالعلوم کے پروگرام میں ہمہ گیری اور معاشی ضروریات سے ہم آہنگی کا رجحان نظر آتا ہے ۔

4- مالی و انتظامی پہلو

دیو بند نے اپنی داخلی آزادی کی خاطر حکومت سے مکمل لاتعلقی اختیار کی ۔ چندے کے لیے عام لوگوں سے رجوع کرنے سے دارالعلوم کا تعارف وسیع ہوا ۔ نیز دارالعلوم کے طلبہ اور اساتذہ کی درویشانہ روش اور سادہ مزاجی نے علماء اور اساتذہ کو عوام سے قریب تر کر دیا ۔ جس سے تربیت عامہ کے مواقع پیدا ہوئے ۔ دارالعلوم کے انتظامی معاملات میں اسلام

کے اصول مشاورت کو اختیار کیا گیا ، جس کے مطابق دارالعلوم کا مہتمم شوریٰ کے فیصلوں کے مطابق انتظام و انصرام کے فرائض انجام دیتا تھا ۔

5- جذبۂ حریت

اکابرین دیوبند کے سرفروشانہ جذبے کی وجہ سے آزادی و حریت کا رجحان تحریک دیوبند کے مزاج میں ہمیشہ شامل رہا ۔ لہٰذا ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں دیوبند کے علماء نے اہم کردار ادا کیا ۔

6- تعمیرِ کردار

علماء اور اکابرین دیوبند نے اصلاح اخلاق اور تعمیر کردار کے میدان میں بھی بہت کام کیا ۔ چنانچہ علم و فضا اور درس و تدریس کے ساتھ ساتھ دیوبند میں تقویٰ کی ایک فضا بھی ہمیشہ قائم رہی ۔

7- دیگر تعلیمی ادارے

دیو بند کے زیر اثر ہندوستان میں مظاہرالعلوم سہارنپور ، مدرسہ فیض عام کانپور ، مدرسہ اشرفیہ مراد آباد جیسے مدارس قائم ہوئے ۔ آج بھی دینی تعلیم کے بیشتر مدارس دیوبند کی تحریک سے براہ راست یا بالواسطہ متاثر ہیں ، اس طرح دینی مدارس کا ایک باقاعدہ نظام قائم ہوا ، جس سے مسلمانوں کے قومی نظام تعلیم کی نشأۃ ثانیہ کا آغاز ہوا ۔

8- تصنیفی خدمات

درس و تدریس اور دعوت و ارشاد کے علاوہ علمائے دیوبند کی تصنیفی خدمات بھی علماء ان کا ایک بے مثال کارنامہ ہیں ۔ تفسیر و حدیث ، فقہ ، تصوف ، عربی زبان و ادب اور تاریخ و سیرت کے متعلق علماء دیو بند نے ایسا وسیع ذخیرہ فراہم کر دیا کہ یہ ادارہ برصغیر (جنوبی ایشیا) میں اس میدان میں عالمی قیادت کا دعویدار کہلانے میں حق بجانب ہے ۔

تحریکِ دیوبند پر تبصرہ

1 - تحریک دیوبند کے ذریعے اسلامی علوم کے تحفظ کا اہتمام تو کیا گیا لیکن زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں پر توجہ نہ دی گئی ۔ جس کی وجہ سے عصری علوم بالکل نظر انداز ہو گئے اور اسلامی علوم کا یہ نصاب عملی زندگی کے تقاضوں کا ساتھ دینے سے قاصر رہا ۔

2 - مسلمانوں کے تمام معروف مدارس کی تعلیمی روایات و خصوصیات کو دیوبند میں سمونے کی کوشش کی گئی ۔ لیکن اس سے نصاب غیر ضروری طور پر بوجھل ہو گیا ۔

3 - انگریزوں کے غلبے کے بعد اگرچہ فارسی زبان کی سرکاری حیثیت اور عام کاروباری زندگی میں کلیدی اہمیت ختم ہو گئی ۔ لیکن دیوبند کے نصاب تعلیم میں اسے بلند مقام حاصل رہا ۔ جو عصری علوم کے استفادے میں مشکلات کا باعث بنا ۔

4 - فلسفہ و منطق پر ضرورت سے زیادہ توجہ سے دیوبند میں بحث و مباحثہ کی فضا پیدا ہوئی ، جس نے بعد میں مناظرانہ انداز اختیار کر لیا ۔

5 - دارالعلوم میں جدید علوم کی تدریس کا اہتمام نہ ہو سکا ۔ دوسری طرف جدید تعلیم کے مدارس نے دینی تعلیم کے مؤثر انتظام سے گریز کیا ۔ اس طرح دینی تعلیم اور جدید تعلیم میں ایک خلیج حائل ہو گئی ۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ فاصلہ بڑھتا گیا ۔ اس طرح اسلامی تعلیمات کی جامعیت کے تصور کو نقصان پہنچا ۔

6 - تحریک دیوبند اسلامی ورثے کے تحفظ اور مسلمانوں کا قومی تشخص برقرار رکھنے میں یقیناً کامیاب رہی لیکن مسلمانوں پر مغربی تہذیب کی یلغار کو نہ روک سکی کیونکہ تحریک دیوبند کے متوازی علی گڑھ تحریک اپنے مادی فوائد کی وجہ سے عوام میں آہستہ آہستہ قبول عام کا درجہ حاصل کر گئی ۔

تحریکِ علی گڑھ

پس منظر

1857 ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریز پورے ہندوستان پر قابض ہو گئے تو انھوں نے بھی مسلمانوں کو کچلنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔ اس ضمن میں انھوں نے فارسی کی سرکاری حیثیت ختم کی ، عدالتوں سے قاضی کا عہدہ ختم کیا اور تعلیمی اوقاف اور جاگیروں کو ضبط کر لیا ۔ اس طرح تھوڑے ہی عرصہ میں مسلمانوں کو معاشی اور معاشرتی طور پر مفلوج کر دیا گیا ۔

اس زمانے میں سرسید احمد خان ایک سرکاری ملازم تھے لیکن وہ ایک غیور اور حساس مسلمان بھی تھے ۔ ان سے مسلمانوں کی زبوں حالی دیکھی نہیں جاتی تھی ۔ مسلسل سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ذلت آمیز پستی سے نکلنے کے لیے مسلمانوں کو انگریزی نظام تعلیم سے سمجھوتہ کرکے جدید علوم کے حصول سے بھرپور استفادہ کرنا چاہیے ۔

سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء انگریزی زبان میں مغربی علوم سے استفادہ کرنے کو وقت کی ضرورت سمجھتے تھے لیکن ساتھ ہی وہ اسلامی علوم کی تعلیم سے اسلامی تشخص قائم رکھنا بھی ضروری سمجھتے تھے ۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے کا قیام ضروری سمجھا ۔ علی گڑھ کالج سرسید کی انھی کوششوں کا ثمرہ تھا ۔ جسے وہ آکسفورڈ اور کیمرج کی سطح پر لانے کے خواہش مند تھے ۔

تحریکِ علی گڑھ کے اسباب

علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کے اہم محرکات درج ذیل ہیں ۔

1 - 1857 ء کی جنگ آزادی کے بعد یہ حقیقت بڑی وضاحت کے ساتھ سامنے آچکی تھی کہ اب انگریزوں کی قوت کا مقابلہ میدان جنگ میں بہت مشکل ہے انگریزوں کے ذہن میں

مسلمانوں کے خلاف پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ضروری محسوس کیا گیا ۔ اس مقصد کے لیے مزاحمت کے بجائے تعاون کی راہ مناسب سمجھی گئی ۔ یہ احساس تحریک علی گڑھ کا خاص محرک تھا ۔

2 - مسلمان جدید تعلیم سے دستبردار ہو کر معاشی مشکلات کا شکار ہوگئے تھے ۔ جدید تعلیم ملازمت کے لیے شرط تھی ۔ معاشی بدحالی کا احساس بالآخر مسلمانوں میں جدید تعلیم کے فروغ کا محرک بن گیا ۔

3 - ہندو سیاسی اور معاشی میدان میں اس طرح منصوبہ بندی کر رہے تھے کہ ہندوستان کا مستقبل ان کے ہاتھ میں آ جائے ۔ ان کی اس چال کے توڑ کے لیے جدید تعلیم کا راستہ ضروری محسوس کیا گیا ۔ تحریک علی گڑھ اس احساس کی ترجمان تھی ۔

4 - جدید تعلیم کے حامی مسلمان بھی سرکاری تعلیمی اداروں کے نظام تعلیم سے مطمئن نہ تھے کیونکہ یہ ان کے تہذیبی اور ثقافتی پس منظر کے مطابق نہ تھی ۔ چنانچہ اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ مسلمان اپنی تعلیم کا خود بندوبست کرتے ۔ تحریک علی گڑھ نے یہ ضرورت پوری کر دی ۔

5 - سرسید نے دارالعلوم علی گڑھ کے قیام کے سلسلہ میں نظامت تعلیم کے حکام کے آمرانہ رویے کا تذکرہ خاص طور پر کیا تھا ۔ ان کے خیال کے مطابق سرکاری مدارس میں حکام کی غیر معمولی گرفت سے تعلیمی اداروں کی کارکردگی اور داخلی آزادی متاثر ہوتی تھی ۔ چنانچہ سرکاری اثرات سے آزاد نظام تعلیم کی ضرورت بھی تحریک علی گڑھ کا محرک ثابت ہوئی ۔

6 - سرکاری اور مشنری اداروں میں انگریزی ذریعہ تعلیم تھی اس کے علاوہ انگریزی علوم و فنون اور ادب کی تفہیم مقامی لوگوں کے لیے مشکلات پیدا کر رہی تھی ۔ صرف ذہین طلبہ یا وہ لوگ جو اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے ۔ اس تعلیم سے فائدہ اٹھا سکتے تھے ۔

حصول تعلیم میں یہ مشکل اپنی ضرورتوں کے مطابق نظام تعلیم کی تنظیم کا باعث بنی ۔

7 ۔ مشنری اور سرکاری تعلیمی اداروں کے نصاب میں جا بجا خلاف اسلام مواد موجود تھا ۔ اور عیسائیت کی تبلیغ کھلم کھلا کی جاتی تھی ۔ اس سے مسلمانوں کی نوجوان نسلوں کا اسلام سے برگشتہ ہونے کا خدشہ تھا ۔ چنانچہ سرسید اور ان کے رفقاء نے ان خدشات کے پیش نظر مسلمانوں کے لیے ان کی ضرورتوں کے مطابق تعلیم دینے کی خاطر تحریک کا آغاز کیا ۔

تحریکِ علی گڑھ کے مقاصد

تحریک علی گڑھ کے بانی سرسید کی تحریروں اور تقریروں سے اس تحریک کے مندرجہ ذیل مقاصد ہمارے سامنے آتے ہیں ۔

1 ۔ مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف پائی جانے والی نفرت کو دور کرکے انھیں انگریزی زبان اور جدید علوم کی تحصیل کے لیے تیار کرنا ۔ سرسید نے اپنی ایک تقریر میں کریسنٹ اور کروس (ہلال و صلیب) کو ملانے کا تصور پیش کیا تھا ۔

2 ۔ مسلمانوں میں ایسا حقیقت پسندانہ رویہ پیدا کرنا کہ وہ اپنی عظمت رفتہ کے احساس سے قطع نظر کرکے زندگی کے تلخ حقائق کا مقابلہ کر سکیں ۔

3 ۔ مغربی علوم و فنون کے ذریعے زندگی کی جدید آسائشوں اور سہولتوں سے استفادہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا ۔

4 ۔ مسلمانوں میں سائنسی طرز فکر پیدا کرکے توہم پرستی کا خاتمہ کرنا ۔

5 ۔ تعلیم کے ذریعے مسلمانوں میں ملی شعور کو پختہ کرنا تاکہ مسلمان قوم اپنا قومی تشخص

برقرار رکھ سکے۔

6- مذہب میں اجتہاد کے تصور کو از سر نو تازہ کر کے دینی تعلیم کو جدید مسائل اور عملی زندگی سے ہم آہنگ کرنا۔

7- مسلمانوں کو فرسودہ اور فضول رسوم و رواج کے بجائے مغربی طرز پر جدید طرز زندگی کو رواج دینا۔

الغرض سرسید کے الفاظ میں ان کی تعلیمی تحریک کا مطمع نظریہ تھا کہ "فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہ کا تاج سر پر"۔

تحریکِ علی گڑھ کے اہم اقدامات

تحریک کے مقاصد کے حصول کے لیے سرسید اور ان کے رفقاء نے جو اقدامات کیے ان میں سائنٹیفک سوسائٹی، کمیٹی خواستگاران ترقی، تعلیم مسلمانان ہند، ایم اے او کالج علی گڑھ او محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ سائنٹیفک سوسائٹی نے اورنٹیل اور مغربی لٹریچر اردو میں شائع کرایا۔ اس کے رسالے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزیٹ نے بھی اس سلسلے میں اعلیٰ خدمات انجام دیں۔ کمیٹی خواستگاران ترقی تعلیم مسلمانان ہند نے مسلمانوں کے تعلیمی انحطاط کے اسباب کا کھوج لگایا۔ اصلاح احوال کے لیے 27 مئی، 1875ء کو سرسید نے ایم اے او ہائی سکول علی گڑھ قائم کیا۔ جسے دو سال کے بعد کالج کا درجہ دے دیا گیا۔ 1878ء میں علی گڑھ کالج کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی سے ہوگیا۔

کالج کی خوبصورت عمارت کا نقشہ سرسید نے خود مرتب کیا تھا۔ جس میں عالی شان مسجد، متعدد لیکچر روم اور ہال تھے۔ طلبہ کے لیے ہاسٹل کی عمارت تھی۔ 1920ء تک 20 ہاسٹلز قائم ہو چکے تھے۔ لائبریری میں انگریزی اور مشرقی علوم کی 18140 کتب موجود تھیں۔ اردو اور فارسی کے 731 مخطوطات اس کے علاوہ تھے۔ 1921ء میں ایم اے او کالج

علی گڑھ کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا درجہ دے دیا گیا ۔ پہلے علی گڑھ کالج اور بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی کو علی گڑھ تحریک کے مرکزی ادارے کی حیثیت حاصل رہی ۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ تحریک کی وہ متحرک تنظیم ہے جس نے اس تحریک کو بالآخر ایک فعال سیاسی تحریک کی شکل دے دی ۔ یہ تنظیم 1886ء میں قائم ہوئی اور اس کا مقصد مسلمانوں میں اعلیٰ مغربی تعلیم کا فروغ اور دینی تعلیم کی اصلاح تھا ۔ اس کانفرنس کی شاخیں پورے برصغیر میں قائم ہوئیں اور دور دراز علاقوں میں بڑے بڑے جلسے منعقد ہوئے ۔ اس کانفرنس کی مسلسل کوششوں کی وجہ سے ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے تعلیمی ادارے کھولنے کا رجحان عام ہوا ۔ اس کانفرنس کا سیاسی کارنامہ یہ ہے کہ 31 دسمبر 1906ء کو اس کانفرنس کے اجلاس ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا ۔ جس نے برصغیر کے مسلمانوں کو سیاسی قیادت فراہم کر کے پاکستان قائم کیا ۔

تحریکِ علی گڑھ کی خصوصیات

1۔ طلبہ کی تربیت

علی گڑھ نے ایک اقامتی ادارے کی حیثیت سے تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا فریضہ انجام دے کر مسلمانوں کو مجلسی زندگی کے لیے تیار کیا ۔

2۔ سماجی مشاغل

طلبہ کی ہمہ گیر نشوونما کے لیے رائیڈنگ کلب ، سوئمنگ پول ، کرکٹ کلب اور یونین کلب قائم تھے ۔ طلبہ یونین اور اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے طلبہ میں قائدانہ صلاحیتیں پیدا کیں ۔

3۔ طلبہ کے لیے سہولیات

کالج کے شفاخانہ میں باقاعدہ اسسٹنٹ سرجن اور طبیب مقرر تھے ۔ ایک بک ڈپو کے علاوہ کتابوں کی اشاعت کا انتظام بھی تھا ۔ ہاسٹل امیر اور غریب طلبہ کی استطاعت کے مطابق تھے ۔ نیز محسنین کے عطیات اور حکومت کی گرانٹ سے ذہین طلبہ کے لیے انعامات ،میڈل ،

وظائف اور قرض حسنہ کا انتظام بھی تھا ۔ سر آغا خان کے نام سے بیرون ملک تعلیم کے لیے وظیفہ کا انتظام بھی تھا ۔

4 - انتظامیہ

کالج کے نظام کی ذمہ دار 1885 ء تک مجلس انتظامیہ تھی ۔ بعد میں یہ ذمہ داری ٹرسٹیز کمیٹی کو سونپی گئی ، جس کے سیکرٹری کے طور پر سرسید' ان کے بیٹے سید محمود ، نواب محسن الملک اور وقارالملک نے یکے بعد دیگرے خدمات انجام دیں ۔ کالج کا پرنسپل ، دو پروفیسر اور ہائی سکول کا ہیڈ ماسٹر لازماً یورپیئن ہوتے تھے تاکہ طلبہ تعلیم کے ساتھ ساتھ اساتذہ سے مغربی طور طریقے سیکھ لیں ۔ انگریز اساتذہ کے تقرر سے انگریزوں سے مفاہمت اور حکومت سے گرانٹ کے علاوہ طلبہ کے لیے ملازمت کے مواقع بھی ملتے تھے ۔

5 - دینی تعلیم

مغربی علوم کی تدریس کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کا انتظام بھی تھا ۔ یہ کوئی معیاری انتظام نہ تھا ۔ بس اس دور کی مروجہ انگریزی تعلیم کے ساتھ محض دینیات کے ایک مضمون کا اضافہ کر دیا گیا تھا ۔

6 - خواص کی تعلیم

تعلیم کی اشاعت کے سلسلہ میں سرسید خواص کی تعلیم کے قائل تھے جب کہ مسلمانوں نے جنوبی ایشیا میں اپنے دور اقتدار میں عام اور مفت تعلیم کی روائیت قائم کی تھی ۔

تحریکِ علی گڑھ کے اثرات

علی گڑھ تحریک نے برصغیر جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کی تعلیمی سماجی ، معاشی اور سیاسی زندگی پر گہرے اور دور رس اثرات مرتب کیے ۔ ان کی ایک جھلک ذیل میں پیش کی جاتی ہے ۔

1 - انگریزوں اور مسلمانوں میں مفاہمت

علی گڑھ تحریک سے مسلمانوں اور انگریزوں میں مفاہمت کی ابتدا ہوئی اور مسلمان جدید

علوم کے حصول کے ذریعے دوبارہ عملی زندگی میں شریک ہو گئے ۔

2- مسلمانوں کی معاشی خوش حالی

جدید تعلیم کے حصول سے مسلمانوں کو روز گار کے مواقع حاصل ہوئے ۔ اس کا ایک ناخوشگوار پہلو یہ تھا کہ تعلیم برائے ملازمت کے نظریے کی وجہ سے مسلمان زندگی کے دوسرے معاشی شعبوں جیسے زراعت اور تجارت وغیرہ میں پیچھے رہ گئے اور تعلیم یافتہ بے روز گاروں میں اضافہ ہوتا گیا ۔

3- اُردو زبان کی ترقی

علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کے سب سے زیادہ مفید اثرات اردو ادب پر مرتب ہوئے ۔ اردو مسلمانوں کی قومی زبان کے طور پر متعارف ہوئی ۔ سرسید ، حالی ، شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد نے اردو کو زندہ زبانوں میں ایک اہم مقام دلایا اور اسے سائنس اور سماجی علوم کی زبان بنایا ۔

4- سیاسی تربیت

مسلمانوں میں قومی زندگی کا شعور پیدا کرنے میں علی گڑھ کو نمایاں حیثیت حاصل ہے ۔ علی گڑھ کی سب سے اہم خدمت دو قومی نظریے کی ترویج و اشاعت ہے ۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ انگریزوں سے مفاہمت کی خاطر قائم ہونے والے ادارے نے حصول پاکستان کے سلسلے میں انگریزی اقتدار کے خاتمے میں بھرپور کردار انجام دیا ۔

5- تعلیمی اداروں کا قیام

تحریک علی گڑھ کے زیر اثر پورے برصغیر کے مسلمانوں میں جدید تعلیم کے فروغ کی ایک رو چل نکلی ۔ مختلف خطوں میں ترقی تعلیم کے لیے مسلمانوں نے مختلف تنظیمیں قائم کیں ۔ ان میں انجمن اسلام بمبئی ، انجمن حمایت اسلام لاہور اور سندھ محمڈن ایسوسی ایشن کراچی بالخصوص قابل ذکر ہیں ۔ ان تنظیموں کے زیر اہتمام متعدد تعلیمی ادارے قائم ہوئے ، جنھوں نے مسلمانوں کی تعلیمی اور سیاسی زندگی میں اہم خدمات انجام دیں ۔

6 - مغرب پسندی

علی گڑھ تحریک کے مزاج میں خرابی کا ایک پہلو بھی مضمر تھا اور وہ مغربی تہذیب کے متعلق مرعوبیت کا رحجان تھا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی تہذیب کو تو علی الاعلان اپنایا گیا اور اسلام کے معاملے میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیا گیا ۔

ندوی تحریک

پس منظر

مسلمان اہل فکر کے ایک گروہ کی رائے تھی کہ تحریک علی گڑھ مسلمانوں کی توقعات پر پوری نہیں اتر سکی ۔ مولانا شبلی کی علی گڑھ سے بیزاری کی یہی وجہ تھی ۔ دوسرے بہت سے مسلم اکابرین کی طرح وہ حتمی طور پر اس نتیجے پر پہنچے کہ علی گڑھ سے اسلامی علوم و ثقافت کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے ۔ وہ دینی مدارس کی تعلیم کو بھی عصری تقاضوں کے لیے ناکافی سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ ایسا متوازن نصاب تعلیم رائج کیا جائے جو مسلمانوں کو عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم سے بھی بہرہ ور کرے ۔ ندوی تحریک اسی احساس کی پیداوار تھی ۔

دارالعلوم ندوہ کا قیام

مولانا شبلی نعمانی کی تجاویز پر علما کی تنظیم ندوتہ العلما کے اجلاس منعقدہ لکھنو 1894 ء میں دارالعلوم ندوتہ العلما کے قیام کا فیصلہ ہوا ۔ لیکن وسائل کی قلت کی وجہ سے دارالعلوم میں باقاعدہ تدریس کا آغاز 1898 ء میں ہوا ۔ مولانا محمد علی مونگیری اس کے پہلے ناظم مقرر ہوئے ۔ ندوہ میں مولانا شبلی کی وہی حیثیت تھی جو سرسید کی علی گڑھ میں تھی ۔

دارالعلوم میں 1898 ء میں صرف چند درجات میں تدریس کا آغاز ہوا تھا البتہ ایک سال بعد شاہ جہاں پور کے رئیسوں نے ندوہ کے لیے کچھ زمین وقف کر دی ۔ 1900 ء میں ریاست حیدر آباد نے اور 1905 ء میں ریاست بھوپال نے ماہوار امداد کا انتظام کیا ۔ ریاست

پٹیالہ کے وزیر خارجہ کرنل عبدالمجید ، جناب محسن الملک اور جسٹس شریف الدین کی کوششوں سے ندوہ کے بارے میں حکومت کی غلط فہمیاں دور ہوئیں ۔ اور 500 روپے کی ماہوار سرکاری گرانٹ منظور ہوئی ۔ نواب آف بہاولپور کی والدہ محترمہ نے پچاس ہزار روپے کی خطیر رقم عمارات کی تعمیر کے لیے بطور عطیہ دی ۔ چنانچہ وسائل کی فراہمی سے دارالعلوم کی تعمیر کا آغاز ہوا ۔

مقاصد

ندوی تحریک کا مقصد دیوبند اور علی گڑھ کی درمیانی روش اختیار کرنا تھا ۔ تاکہ قدیم اور دینی تعلیم کے نصاب میں اصلاح کر کے جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالا جائے ۔ نیز جدید علوم سے استفادہ بھی کیا جائے ۔ ندوۃ العلماء کے مقاصد درج ذیل تھے ۔

1- نصاب تعلیم کی اصلاح ، علوم دین کی ترقی ، تہذیب و اخلاق اور شائستگیٔ اطوار ۔
2- علماء کے باہمی نزاع کو رفع کر کے اختلافی مسائل کا سدِباب کرنا ۔
3- عام مسلمانوں کی اصلاح و فلاح اور اس کی تدابیر ۔ مگر سیاسی اور ملکی معاملات سے علیحدگی ۔
4- ایک عظیم الشان اسلامی دارالعلوم کا قیام جس میں علوم و فنون کے علاوہ عمل صالح کی بھی تعلیم ہو ۔
5- محکمۂ افتا کا قیام جہاں سے فقہی معاملات اور مسائل کے متعلق رہنمائی بہم پہنچائی جا سکے ۔

نصاب

تحریک ندوہ کا نصب العین قدیم اسلامی مدارس کے نصاب کی اصلاح تھا ۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ قدیم علوم کو جدید تقاضوں کے مطابق پیش کیا جائے اور جدید علوم کو بھی شامل نصاب کیا جائے ۔ عملاً دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام کے بعد بھی کچھ عرصہ تک دارالعلوم کے اساتذہ پرانا نصاب پڑھاتے رہے ۔ جب مولانا شبلی خود حیدر آباد سے منتقل ہو کر دارالعلوم آ

گئے تو حقیقی اصلاح کا عمل شروع ہوا ۔ اس سلسلے میں درس نظامی میں جو فلسفہ و منطق کا غلبہ تھا ، اسے ختم کیاگیا اور اس کی بجائے ندوہ کے نصاب میں تفسیر و حدیث پر زیادہ زور دیاگیا ۔ جدید علوم میں سے انگریزی کی تدریس کو لازمی قرار دیا گیا اور عربی زبان و ادب کی تدریس میں بھی جدید عربی پر خاص زور دیا گیا ۔

خصوصیات

1- نصاب کی اصلاح

ندوہ میں پرانے نصاب تعلیم میں تفسیر و عقائد اور شریعت کے احکام کو مناسب جگہ دی گئی ۔ فلسفہ جدید اور انگریزی زبان کو شامل نصاب کیاگیا ۔ اس کے علاوہ صرف و نحو کے مقابلے میں ادب و انشاء پر زیادہ توجہ دی گئی ۔

2- طلبہ کی تربیت

یہ ایک رہائشی ادارہ تھا جس میں طلبا کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا اہتمام بھی کیاگیا ۔ اس کے علاوہ صنعتی فنون کو بھی ندوہ کے پروگرام میں شامل کیاگیا لیکن اس میں خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی ۔

3- اساتذہ اور طلبا کے تعلقات

طلبا اور اساتذہ کے تعلقات بہت خوش گوار تھے ۔ خاص طور سے علامہ شبلی نے اپنے شاگردوں عبدالسلام ندوی ، سید سلیمان ندوی وغیرہ کی تربیت بہت اخلاص اور محنت سے کرکے ان کی بے مثل تعلیمی و تصنیفی صلاحیت کو خوب نکھارا ۔ ان حضرات نے تاریخ و سیرت اور دیگر تصانیف سے عالم اسلام کی بہت خدمت کی ۔

4- جدید عربی پر خصوصی توجہ

ندوہ میں جدید عربی کی تدریس ایک زندہ زبان کے طور پر کی گئی ۔ یہاں کے طلبا

عربی میں تحریر و تقریر کے ماہر تھے ۔ ہندوستان کے علاوہ عرب ممالک میں بھی ان کی اس صلاحیت کو تسلیم کیا گیا ۔

5 - عالم اسلام سے رابطہ

اس تحریک نے علی گڑھ اور مصر سے تعلیمی لحاظ سے خاطر خواہ استفادہ کیا ۔ مولانا شبلی علی گڑھ میں ایک عرصہ مدرس رہے تھے اور اس عرصہ میں مصر بھی گئے تھے ۔ مصر کے علما سے ان کے براہ راست روابط کی وجہ سے ندوہ کو بہت سے تعلیمی فوائد حاصل ہوئے ۔ مصر کے علمی و ادبی وسائل سے ندوہ کے اساتذہ اور طلبا استفادہ کرتے تھے ۔ علمی اعتبار سے یہ بات اس لیے اہم ہے کہ مصر یورپ سے قربت کی بنیاد پر جدید تعلیم سے متاثر تھا ۔ اس طرح ندوہ کو دنیا کے جدید علوم و فنون سے آگاہی ہوئی ۔ جدید عربی کی تدریس ، عربی تحریر و تقریر میں اعلیٰ صلاحیت اور عرب اساتذہ اور مصری علماء سے تعلق کی وجہ سے اس تحریک کا تعلق عالم اسلام سے قائم رہا ۔

6 - داخلی آزادی

تعلیم و تحقیق کی فضا کے ساتھ ساتھ ندوہ نے اپنی آزادی کو برقرار رکھا اور سرکاری گرانٹ کے باوجود ادارے کی داخلی آزادی برقرار رکھی گئی ۔

7 - وسیع ذخیرہ کُتب

ندوہ میں شبلی کی کوششوں سے ایک وسیع ذخیرہ کتب جمع ہوگیا ۔ جس میں ان کی ذاتی لائبریری اور بھوپال کے نواب صدیق حسن خان اور عمادالملک کی کتب بھی شامل تھیں ۔

اثرات

1 - دنیائے اسلام سے تعلق کی بناء پر ندوہ نے مصنفین کی ایسی ٹیم تیار کی جس نے تاریخ ،

سیرت ، ادب اور صحافت میں عظیم کارنامے انجام دیئے ۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں سید سلیمان ندوی ہیں ۔

2 - ندوتہ العلماء نے ایک رسالہ "الندوہ" جاری کیا ، جو اس تحریک کا ترجمان تھا ۔ دینی موضوعات پر اس کی تحریروں نے علماء کو بہت متاثر کیا ۔

3 - دارالمصنفین اعظم گڑھ نے اسلامی علم و ادب کی تحقیق و اشاعت میں جو نمایاں خدمات انجام دیں وہ تعارف کی محتاج نہیں ۔ یہ ادارہ بھی ندوی تحریک ہی کی پیداوار تھا ۔ اس سے منسلک ماہرین اور محقیقین دارالعلوم ندوۃ العلماء سے وابستہ تھے یا وابستہ رہ چکے تھے ۔

4 - جامعہ عباسیہ بہاولپور کی تعلیمی خدمات بھی برصغیر میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں اس جامعہ نے دارالعلوم ندوتہ العلماء کی ہی پیروی کی تھی ۔

5 - تحریک ندوہ کا مرکزی کردار مولانا شبلی نعمانی تھے ۔ انھوں نے اپنی بے مثل صلاحیتوں سے اپنے تمام ہم عصروں کو متاثر کیا ۔ بیسویں صدی کے مسلم مفکرین پر ان کے انداز کی گہری چھاپ ہے ۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ

پس منظر

بیسویں صدی کا آغاز برصغیر میں مسلمانوں اور انگریزوں کی کشمکش کے سلسلے میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے ۔ تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون اس دور کی اہم سیاسی تحریکیں تھیں ۔ اس دور میں محسوس کیا گیا کہ مسلمانوں کی تعلیم کو ملّی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ضروری ہے ۔ اس دور میں علی گڑھ کو مسلمانوں کے تعلیمی مرکز کی حیثیت حاصل تھی ۔ لیکن اس ادارے کی تمام تر کوششیں ملّی امنگوں کو مکمل طور پر حاصل کرنے میں ناکام ہو چکی تھیں ۔ سرکاری گرانٹ کی وجہ سے اس پر سرکاری اثرات غالب تھے اور یہاں کے تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی سرکار نوازی کا انداز نمایاں تھا ۔

علی گڑھ سے وابستہ حساس افراد نے علی گڑھ کے انداز میں اصلاح کی مہم چلائی ۔ ان میں مولانا محمد علی جوہر نمایاں تھے ۔ اصلاح احوال کے لیے ان کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں

تو انھوں نے علی گڑھ سے علیحدگی اختیار کر کے علی گڑھ کے متوازی ایک نیا ادارہ قائم کیا جس کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ رکھا گیا ۔ یہ مولانا جوہر کے عزم کا شاہکار ہے یہ جامعہ علی گڑھ کالج کی عمارت کے قریب ہی خیمے لگا کر شروع گئی ۔ اس جامعہ کی بنیاد 29 اکتوبر ، 1920ء کو رکھی گئی ۔ 1925ء میں اسے دہلی منتقل کر دیا گیا ۔

مقاصد

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے مندرجہ ذیل مقاصد تھے

1 - مسلمانوں کو جدید تعلیم اور مذہبی تعلیم سے آراستہ کرنا ۔ مولانا محمد علی جوہر نے جامعہ کے تعارفی کتابچے میں لکھا کہ ہمارا مطمع نظر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ ہم اپنی درسگاہوں میں ایسے نوجوان پیدا کریں جو زمانہ کے معیار کے مطابق تعلیم و تربیت یافتہ شمار کیے جانے کے مستحق ہوں ۔ نیز وہ صحیح معنوں میں مسلمان بھی ہوں ۔ جن میں اسلام کی روح ہو اور جو اپنے مذہب سے مکمل طور پر بہرہ ور ہوں اور بطور مبلغین اسلام دوسروں کی امداد سے بے نیاز ہو کر خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں ۔

2 - جامعہ میں قرآن مجید سے پوری واقفیت کو جامعہ نے اپنی تعلیم کا سنگ بنیاد قرار دیا ۔

3 - مسلمانوں کو سرکاری ملازمت سے بے نیاز کرنے اور محنت کی عظمت کو اجاگر کرنے کے لیے صنعت و دستکاری کی تعلیم کو لازمی کیا ۔

4 - دینی اور دنیوی علوم میں ہم آہنگی اور امتزاج پیدا کیا ۔

مدارج تعلیم اور نصاب

جامعہ ملیہ کے نصاب اور مدارج تعلیم کا تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے ۔

مدارج تعلیم : 1 - مکتب 2 - منزل اول 3 - منزل ثانوی 4 - منزل اعلیٰ 5 - درجہ فاضل ۔

1 - مکتب

اس کے لیے تعلیم کی مدت دو سال مقرر کی گئی ۔ یہ درجہ 5 سال سے 7 سال تک کی عمر کے

طلبہ کے لیے تھا ۔ ان دنوں بچوں کو عموماً باقاعدہ طور پر مدارس میں داخل کرانے سے پہلے گھر میں لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا تھا ۔ البتہ جو ابتدائی گھریلو تعلیم کے بغیر جامعہ میں داخل ہوتا اسے منزل اول سے پہلے مکتب کے نصاب کے مطابق اردو اور عربی قاعدہ کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کی چند صورتیں یا ترجمہ پڑھائی جاتی تھیں۔ کاپی اور تختی پر چھوٹے چھوٹے جملوں کی املا ، گنتی ، زبانی جمع تفریق سکھائے جاتے تھے ، بچوں کو مذہبی اور اخلاقی کہانیاں سنائی جاتی تھیں ۔

2 ۔ منزل اوّل

اس کی مدت تعلیم 5 سال تھی جسے طلباء بارہ سال کی عمر میں مکمل کرتے تھے ۔ باترجمہ ، ناظرہ قرآن مجید کے علاوہ منتخب آیات اور صورتیں حفظ کرائی جاتی تھیں ۔ طہارت ، نماز اور عملی حساب کی تعلیم و تربیت کے علاوہ عقائد ، عبادات اور سیرت کے بارے میں معلومات دی جاتی تھیں ۔ زبان و ادب ، سائنس ، تاریخ جغرافیہ ، خوشخطی اور عبارت نویسی پر توجہ دی جاتی تھی ۔ پہلے دو برس میں امتحان نہیں لیا جاتا تھا ۔

3 ۔ منزل ثانوی

انٹر میڈیٹ کے برابر 5 سالہ نصاب جسے طلبا سترہ سال کی عمر میں مکمل کرتے تھے ۔ دینیات ، عربی ، زبان اور حرفت لازمی مضامین تھے ۔ اختیاری مضامین میں کوئی ایک ایشیائی یا یورپی زبان ، تاریخ ، جغرافیہ ، علم سیاسیات ، دینیات ، معاشیات ، سائنس و ریاضیات ، منطق اور نفسیات وغیرہ میں سے تین مضامین پہلے تین سال میں اور دو مضامین آخری دو سال میں پڑھائے جاتے تھا ۔ دینیات میں مضامین و مطالب قرآن ، اصول تفسیر ، فقہ ، فرائض اور سیرت و حدیث شامل تھے ۔

4 ۔ منزل اعلیٰ

دینیات اور تاریخ اسلام کے لازمی مضامین کے ساتھ اس کی مدت تین سال تھی ۔

اختیاری مضامین میں علوم اسلامی ، تاریخ اجتماعیات ، فلسفہ ، سائنس اور ریاضیات وغیرہ شامل تھے ۔ اس کے علاوہ کسی مقامی زبان میں کوئی کتاب تصنیف کرنی پڑتی تھی ۔ اس پورے نصاب کی تکمیل پر ایم ۔ اے ، ایم ۔ ایس ۔ سی کے برابر ڈگری ملتی تھی ، جس کا درجہ غیر ملکی یونیورسٹیوں کے بی ۔اے کے برابر تھا ۔

5 - درجہ فضیلت

مندرجہ بالا مضامین میں جامعہ کا سند یافتہ مزید تحقیقات و مطالعہ سے مقالہ تصنیف کرکے ڈاکٹریٹ کی سند کا امیدوار بن سکتا تھا ۔

خصوصیات

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مندرجہ ذیل خصوصیات تعلیمی لحاظ سے بہت اہم ہیں

1 - سادگی اور اخلاص

جامعہ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ نے اعلیٰ سرکاری مناصب حاصل کرنے کی بجائے جھونپڑوں میں تعلیم و تدریس اور تصنیف کا کام کرکے ایثار و قربانی کی عمدہ مثالیں پیش کیں ۔ جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ نے انتہائی سادہ زندگی اختیار کرکے اپنی غیرت اور آزادی کو برقرار رکھا ۔

2 - فنی تربیت

جامعہ ملیہ نے حرفت کی تعلیم اور صنعتی ادارے کے انتظام کی بدولت طلبہ کو معاشی طور پر سرکاری ملازمت سے آزاد کرنے کی کوشش کی تاکہ طلبہ کو تعلیم کے بعد بے ررزگاری کا سامنا نہ کرنا پڑے ۔

3- تصنیفات

یہاں کے اساتذہ نے تحقیق و تصنیف کو عبادت سمجھ کر اپنایا۔ جامعہ کے ذیلی اداروں اردو اکیڈمی اور دارالاشاعت نے متعدد علمی، ادبی اور سوانحی کتب شائع کیں۔

4- قدیم و جدید امتزاج

نصاب میں جدید اور دینی علوم میں توازن کو مد نظر رکھا گیا۔ دینیات اور عربی کی لازمی تدریس سے دینی علوم کا حصول آسان ہوگیا۔ قرآن و حدیث، فقہ، سیرت اور تاریخ اسلام پر مشتمل علوم اسلامی کی تعلیم درجہ تحقیق تک دی جاتی تھی۔

5- اُردو بطور ذریعۂ تعلیم

اردو کے ذریعے تعلیم ایک انقلابی قدم تھا۔ اس سلسلے میں اگرچہ جامعہ عثمانیہ کو اولیت حاصل تھی۔ لیکن جامعہ ملیہ نے سند کے حصول کے لیے کسی مقامی زبان میں کتاب کی تصنیف کی مستقل شرط عائد کی، جس سے اردو میں درسی کتب کا ذخیرہ جمع ہوگیا۔ نیز جامعہ میں ہندو اہل قلم نے سنسکرت کی کتابوں کے تراجم کیے جن سے علمی فوائد حاصل ہوئے۔

6- تربیت و کردار

جامعہ کو اقامتی انداز میں چلایا گیا۔ اس طرح طلبا اور اساتذہ کے ہمہ وقتی ربط کے ذریعے تعلیم و تدریس کے ساتھ تربیت و کردار کا مقصد بھی حاصل ہوتا رہا۔

اثرات

جامعہ ملیہ اسلامیہ کو حکومت وقت کی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لہٰذا اس کے

اثرات بہت زیادہ نمایاں نہ ہو سکے ۔ بہر حال یہ اس جامعہ کا کارنامہ ہے کہ اس نے اردو ذریعہ تعلیم کو اپنا کر اردو کے فروغ کا راستہ ہموار کیا ۔ اس طرح اردو زبان میں تصنیف و تالیف کو بھی وسعت حاصل ہوئی ۔ جامعہ کے نصاب میں حرفتی تعلیم پر بھی توجہ دی گئی ۔ اس کا مثبت اثر یہ ہوا کہ جامعہ کے تعلیم یافتہ افراد محنت کی عظمت کے تصور سے سرشار ہوتے تھے اور اس تصور نے انھیں سرکاری ملازمت سے بے نیاز کر دیا تھا ۔

ملّی تصورات کے مطابق جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم کی تدریس کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک کامیاب تجربہ تھا ۔ لیکن اساتذہ کے علم و فضل اور ایثار کے باوجود حکومت کے عدم تعاون اور وسائل کی قلت کی وجہ سے یہ تحریک وسیع اثرات کی حامل نہیں ہو سکی ۔ وطنی قومیت کی حمایت اور دو قومی نظریے کی مخالفت کے سبب برصغیر کے مسلمانوں میں اسے قبول عام بھی حاصل نہ ہو سکا ۔

مشقی سوالات

1 - دینی تعلیم کے حامی علماء نے کن اسباب کی بناء پر دارالعلوم دیوبند قائم کیا ؟ وضاحت کریں ۔
2 - دارالعلوم دیوبند کے مالی وسائل کیا تھے ؟
3 - نصاب دیوبند پر مختصر نوٹ لکھیں ۔
4 - دارالعلوم دیوبند کی خصوصیات بیان کریں ۔
5 - تحریک دیوبند نے ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل پر کیا اثرات مرتب کیے ؟ وضاحت کریں ۔
6 - تحریک علی گڑھ وقت کی اہم ضرورت تھی ؟ بحث کیجیے ۔
7 - تحریک علی گڑھ نے ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کو کس طرح متاثر کیا ؟

8- ندوی تحریک کے اسباب بیان کریں

9- ندوہ کے نصاب کی خصوصیات بیان کریں۔

10- تصنیف و تالیف میں ندوی حضرات کی خدمات پر نوٹ لکھیں۔

11- جامعہ ملیہ اسلامیہ نے مسلمانان ہند کی سیاسی زندگی پر کیا اثرات مرتب کیے ؟

12- جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خصوصیات بیان کریں۔

13- جامعہ ملیہ اور ندوہ کے اثرات کا تقابلی جائزہ پیش کریں۔

14- پاکستان کے نظام تعلیم پر کس کس تعلیمی تحریک کے کس حد تک اثرات ہیں ؟

درج ذیل بیانات میں خالی جگہ پر کریں۔

- دیو بند کے بانی مولانا ---- تھے۔
- تحریک دیوبند کے زیر اثر برصغیر میں متعدد ------ قائم ہوئے۔
- سرسید نے پہلا مدرسہ ------ میں قائم کیا۔
- علی گڑھ میں جو مقام سرسید کو حاصل تھا وہی حیثیت ------ کو ندوہ میں حاصل تھی۔
- مشرکانہ رسوم اور بدعات کے خلاف جہاد تحریک ------ کی سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت تھی۔
- جدید عربی میں مہارت ------ کی خصوصیت تھی۔

باب 4

پاکستان میں تعلیم کا ارتقاء

نظریۂ حیات

پاکستان ایک مخصوص نظریۂ حیات کی بنیاد پر قائم ہوا ۔ قائد اعظم نے پاکستان کو نظریاتی مملکت کہہ کر پکارا تھا ۔ اس لحاظ سے پاکستان کا وجود ایک نظریۂ حیات پر مبنی ہے ۔ اس اعتبار سے قیام پاکستان کی جدوجہد کرنے والے برصغیر کے تمام مسلمان ایک نظریے کے علمبردار تھے اور پاکستان میں بسنے والے تمام پاکستانی اس نظریاتی ورثے کے تحفظ کے ذمہ دار ہیں ۔ لیکن اس نظریاتی ورثے کو آئندہ نسلوں میں صرف تعلیم کے ذریعے ہی منتقل کیا جا سکتا ہے ۔ نظریے اور تعلیم کے تعلق اور نظریے کے تعلیم پر اثرات بیان کرنے سے قبل نظریۂ حیات کی اصطلاح کی توضیح ضروری معلوم ہوتی ہے ۔

انسان زندگی کے بارے میں ایک مجموعی تصور رکھتا ہے ۔ وہ فطرت ، اپنے وجود ، معاشرے ، دیگر افراد سے اپنے تعلقات ، معاشی ، سیاسی امور ، اخلاق ، غرض یہ کہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں ایک مخصوص تصور کا حامل ہوتا ہے ۔ اس طرح ان امور کے بارے میں ایک معاشرے کے تمام افراد اجتماعی طور پر ایک تصور اختیار کر لیتے ہیں ۔ ہر شے یا مظہر کے بارے میں وہ خیالات و افکار کے ایک مربوط اور منضبط نظام کو اپنا لائحہ عمل بنا لیتے ہیں ۔ یہی ان افراد کی اجتماعی زندگی کا نظریہ ہوتا ہے ۔

اس طرح نظریۂ حیات کی بنا پر ایک معاشرے میں بسنے والے افراد شعوری انداز میں ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں ۔ ان میں ذہنی اور معاشرتی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور وہ مستقبل کے بارے میں ایک ہی طرح کی سوچ کے حامل ہوتے ہیں ۔

نظریۂ پاکستان

پاکستان ، بقول علامہ اقبال اور قائد اعظم ایک نظریاتی مملکت ہے ۔ اور یہ ایک مخصوص نظریۂ حیات کی بنیاد پر قائم ہوئی ۔ جسے نظریہ پاکستان کہا جاتا ہے ۔ نظریۂ پاکستان کی توضیح اور تعریف سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ پاکستان کا مطالبہ کن وجوہات کی بنا پر کیا گیا تھا ۔ مختصراً یہ وجوہات درج ذیل ہیں ۔

الف) غیر منقسم ہندوستان میں مسلمان ایک الگ قوم تھے ۔ اور مسلمانوں کے نزدیک قومیت کی بنیاد وطنیت کے تصور کی بجائے اسلام پر تھی اس لیے وہ ہندؤوں سے الگ قوم تھے ۔

ب) چونکہ تعداد کے اعتبار سے مسلمان اقلیت میں تھے اور جمہوریت کی بنیاد پر ہندو یعنی اکثریتی گروہ حکومت میں زیادہ موثر تھے ۔ لہٰذا ایسی حکومت کے تحت مسلمانوں کے قومی وجود کو نقصان پہنچ سکتا تھا ۔ چنانچہ اپنا قومی تشخص برقرار رکھنے کے لیے مسلمانوں کو ایک علیٰحدہ وطن درکار تھا ۔

ج) مسلمان ، اس وطن میں اپنی تہذیب ، تمدن اور نظریہ حیات (یعنی اسلام) کا تحفظ اور نفاذ چاہتے تھے اور ایک علیٰحدہ وطن کے بغیر ایسا ممکن نہیں تھا ۔ لہٰذا انھوں نے اپنے لیے ایک علیٰحدہ ملک "پاکستان" کا مطالبہ کیا ۔

مسلمانان ہند نے اس بنیاد پر بیک وقت انگریزوں اور ہندؤوں سے آزادی کے لیے جدوجہد کی تاکہ وہ اپنی تہذیب و تمدن کی حفاظت کر سکیں ۔ اس لحاظ سے نظریۂ پاکستان کی تعریف ان الفاظ میں کی جا سکتی ہے ۔

"نظریۂ پاکستان ، ان تصورات اور نظریات کا مجموعہ ہے جن کے مطابق مسلمانوں کو اپنے دین ، ثقافت ، تہذیب اور تاریخ کا تحفظ کرنے ، اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اسلام کے مطابق بسر کرنے اور قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق جمہوریت ، آزادی ، مساوات ، رواداری اور معاشرتی انصاف کے اصولوں کو نافذ کرنے کے لیے علیٰحدہ مملکت و ریاست ، پاکستان کے نام سے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی اور پھر مسلسل جدوجہد سے اس مملکت خدا

داد کا قیام وجود میں آیا اور انھی تصورات کی بنا پر یہ خوشحالی اور ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور رہے گا ۔"

نظریۂ پاکستان ایک جانب قوم کے وجود و بقا کا جواز ہے تو دوسری طرف وہ قوم کو اسلام پر بحیثیت ضابطۂ حیات کاربند رہنے پر آمادہ کرتا ہے ۔ اس نظریے کا مرکزی نقطہ اسلامی ضابطۂ حیات ہے ۔ اسی لیے 1973 ء کے آئین میں کہا گیا ہے کہ "ایسے اقدامات کیے جائیں گے کہ مسلمانان پاکستان انفرادی واجتماعی طور پر اسلام کے بنیادی عقائد و اصول اور تصورات کے مطابق اپنی زندگی گزار سکیں ۔"

تعلیم اور نظریۂ پاکستان

نظریۂ پاکستان کے فروغ کے لیے تعلیم اہم کردار ادا کر سکتی ہے ۔ تعلیم کے ذریعے ہی سے ہم اس بات کو یقینی بنا سکتے ہیں کہ نظریۂ پاکستان کے مطابق مملکت پاکستان کو استحکام دے سکیں ۔ عوام اور نئی نسل کو پاکستان کے قیام کے مقاصد سے روشناس کر سکیں ۔ انھیں اسلام کے بنیادی عقائد و اقدار کے مطابق زندگی گزارنے کے قابل بنا سکیں ۔ قوم میں اتحاد و یگانگت ، یک جہتی ، اور جذبہ حریت برقرار رکھ سکیں ۔ ان کی سیاسی ، سماجی و معاشی تربیت کر سکیں اور ان کے کردار میں اسلامی آفاقیت اور جذبہ محبت و رواداری سمو سکیں ۔ غرض یہ کہ نظریۂ پاکستان نہ صرف قومی زندگی کا بلکہ تعلیمی نظام کا مرکزی نقطہ اور اساسی اصول ہے ۔ اس لحاظ سے تعلیم پر نظریۂ پاکستان کے درج ذیل اثرات ممکن ہیں ۔

الف) تعلیم کا نصب العین

نظریۂ پاکستان کے تحت سب سے پہلے ہمیں تعلیم کی اساسی غرض و غایت متعین کرنا ہوگی ۔ پاکستان کے مطالبے کی بنیاد اسلام ہے ۔ اس لیے تعلیم کا نصب العین ایسے افراد تیار کرنا ہے جو اسلام پر پکا ایمان اور یقین رکھتے ہوں اور اسلام کے ضابطۂ حیات کے مطابق اپنی زندگی گزارنے کے قابل ہوں ۔ جنھیں اس بات پر پورا بھروسہ ہو کہ ان کی دنیاوی زندگی اور

حیات بعد الموت میں کامیابی اور نجات اسلام کے بغیر ممکن نہیں ۔ اس نصب العین کے تحت تعلیم کے بنیادی مقاصد یہ ہوں گے ۔

i) طلبہ کو قیام پاکستان کی غرض و غایت سے روشناس کرنا ۔

ii) طلبہ میں یہ یقین مستحکم کرنا کہ مسلمان دنیا کی تمام اقوام کے مقابلہ میں ایک منفرد قوم ہیں اور ایک ہی ملت کے افراد کی حیثیت میں انھیں ایک دوسرے سے تعاون کرنا چاہیے ۔

iii) طلبہ میں پاکستان سے دلی محبت کا جذبہ پیدا کرنا ۔

iv) طلبہ میں اسلام کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے کا جذبہ ابھارنا ۔

v) طلبہ میں یہ احساس اجاگر کرنا کہ انھیں دنیا میں خیر ، بھلائی ، عدل و انصاف ، رواداری ، مساوات اور جمہوری اقدار کو فروغ دینا اور نافذ کرنا ہے ۔

vi) طلبہ میں یہ جذبہ ابھارنا کہ اسلام ، امن و آشتی کا دین ہے اور انھیں دنیا میں امن قائم کرنا ہے ۔

vii) طلبہ میں اسلامی تہذیب و ثقافت اور تاریخ پر فخر کرنے کا جذبہ پیدا کرنا ۔

viii) طلبہ میں ایسی صلاحیتیں فروغ دینا کہ وہ تمام شعبوں میں پاکستان کی ترقی کو یقینی بنا سکیں ۔

ب) نصابِ تعلیم

نظریۂ پاکستان کی روشنی میں متعین کردہ مقاصد کے تحت ضروری ہو جاتا ہے کہ تعلیم کی مختلف سطحوں پر نظریہ پاکستان کے مطابق مواد اور سرگرمیاں نصاب میں شامل کی جائیں ۔ نصاب میں وہ مضامین شامل کیے جانا لازمی ہو جاتے ہیں ۔ جن سے طلبہ میں وہ تمام خصوصیات اور صلاحیتیں پیدا ہو سکیں جو پاکستان کو استحکام بخش سکیں ۔ اس وقت ہمارے تعلیمی نصابات میں مطالعہ پاکستان اور اسلامیات کا مضمون شامل نصاب ہے ۔ اب یہ دونوں مضامین تعلیم کی مختلف سطحوں پر لازمی ہیں ۔ نیز دین سے قربت اور امت مسلمہ سے روابط کی خاطر آٹھویں جماعت تک عربی زبان بھی بچوں کو لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جا رہی

ہے ۔ دیگر مضامین (مثلاً اردو ، انگریزی) میں بھی نظریۂ پاکستان کے متعلق مواد شامل کیا گیا ہے ۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں یہ بات بھی ضروری ہو جاتی ہے کہ مختلف مضامین میں کوئی ایسا مواد شامل نہ کیا جائے جو اسلام کے اساسی نظریات ، تصورات اور عقائد و اقدار سے مطابقت نہ رکھتا ہو اور اس سے بڑھ کر یہ کہ تمام مضامین چاہے وہ علمی ادبی ہوں یا سائنسی ، ان میں اسلامی نقطۂ نظر واضح اور مثبت طور پر پیش کیا جانا چاہیے ۔ اساتذہ کی تربیت میں بھی نظریۂ پاکستان ، تحریک پاکستان اور اسلامی تعلیمات کو نصاب میں شامل کرنا ضروری ہے ۔

چونکہ معلمی کو اسلامی نقطۂ نظر سے میراث پیغمبری کہا گیا ہے ، اس لیے اساتذہ کو تبلیغ و تدریس کی حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے ۔ یہ تدریس ، دعوت بالحکمت ، موعظہ حسنہ ، جدل حسنہ ، تزکیہ نفس ، تلاوت آیات اور تعلیم حکمت کے اہم اصولوں پر قائم ہونی چاہیے اور مسلمانوں کو اس تدریس کے ذریعے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تعلیم دی جانی چاہیے اور انھیں نیکی اور خیر میں ایک دوسرے سے تعاون کرنا چاہیے ۔

تعلیم کے مقاصد

تعلیم کے مقاصد کی تشکیل میں نظریۂ حیات کو دیگر امور پر زیادہ فوقیت اور ترجیح دی جاتی ہے ۔ تاہم زندگی کے دوسرے شعبوں کو بھی تعلیمی مقاصد کی تشکیل میں بنیاد بنایا جاتا ہے ۔ چنانچہ درج ذیل پہلو خاص اہمیت رکھتے ہیں ۔

1 - نظریۂ حیات ۔ 2 - معاشی نقطۂ نظر ۔ 3 - سیاسی نظام ۔ 4 - مقامی ثقافت ۔ 5 - انفرادی نشوونما ۔

ان بنیادوں پر جو مقاصد تعلیم متعین کیے جاتے ہیں وہ پورے عمل تعلیم کی سمت مقرر کر دیتے ہیں ۔ انھیں مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے نصاب تعلیم تدوین کیا جاتا ہے اور تعلیمی سرگرمیاں انجام دی جاتی ہیں ۔

پاکستان میں تعلیمی مقاصد کا تعین

پاکستان میں تعلیمی مقاصد کے تعین میں نظریۂ پاکستان سب سے اہم ہے ۔ اس

نظریے کی بنیاد اسلام ہے ۔ اس لیے پاکستان میں تعلیم کا نصب العین مومن کامل پیدا کرنا ہے ۔ یعنی ایسے افراد تیار کرنا جو اسلام کی حقانیت پر یقین کامل رکھتے ہوں اور اپنی زندگی میں اسلام کے بنیادی اصولوں پر بھرپور عمل کرتے ہوں ۔

پاکستان میں تعلیم کی بنیادوں کی نشاندہی اور پروگراموں کے تعین کی خاطر مختلف ادوار میں کوششیں کی گئیں ۔ ذیل میں ان پالیسیوں یا رپورٹوں میں بیان کردہ مقاصد کا ذکر کیا جاتا ہے ۔

دسمبر ، **1947** ء میں پہلی تعلیمی کانفرنس کا انعقاد ہوا ۔ بعد ازاں **1959** ء میں تعلیمی کمیشن کی رپورٹ سامنے آئی ۔ پھر تعلیمی پالیسیوں کا اعلان **1970** ء ، **1972** ء اور **1978** ء میں کیا گیا ۔ ان تمام پالیسوں یا رپورٹوں میں تعلیمی مقاصد کا تعین بھی کیا گیا ۔

الف) تعلیمی کانفرنس 1947 ء

اس تعلیمی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے فرمایا "ہمیں ایسی تعلیمی پالیسی اور پروگرام مرتب کرنا ہو گا جو ہمارے عوام کی صلاحیتوں اور ہماری تاریخ و تہذیب سے مطابقت رکھتا ہو اور ہمیں جدید دور کی وسیع ایجادات و ترقیات کا ساتھ بھی دینا ہو گا"

چنانچہ اس کانفرنس کی رپورٹ میں کہا گیا کہ بغیر کسی بنیادی نظریے کے تعلیمی نظام کی تشکیل ممکن نہیں ۔ قومی نظریۂ ہی نظام تعلیم کی اساس ہوتا ہے ۔ پاکستان کے نظام تعلیم کی بنیاد اسلامی نظریۂ حیات پر رکھی جائے اور تعلیم کا نصب العین اسلامی اصولوں کی ترویج اور اشاعت ہو گا ۔

ب) تعلیمی کمیشن 1959 ء

کمیشن کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ہمارے نظام تعلیم کو ان نظریات کی حفاظت کے لیے اہم کردار ادا کرنا چاہیے جو قیام پاکستان کا باعث بنے اور اسے ایک قوم کے تصور کو استحکام بخشنا چاہیے ۔ ہمارا ملک کیوں کہ اسلامی نظریۂ زندگی کی بنیاد پر قائم ہوا ہے اس لیے تعلیم کو اسلامی اقدار کی ترویج اور ان کے تحفظ کی کوشش کرنا چاہیے ۔ تعلیم کے ذریعے حق ،

انصاف ، احساس ، بین الاقوامی اخوت ، آزادی ، سالمیت اور اخلاقی و روحانی اقدار کے تحفظ کی ترویج کرنا چاہیے جو اسلام کا طرۂ امتیاز ہیں ۔ لہٰذا ہمیں پاکستان کے افراد میں اتحاد اور یکجہتی کا احساس بیدار کرنا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ تعلیم افراد کو اس قابل بھی بنائے کہ وہ پیداواری صلاحیتوں سے مزین ہوں اور ذاتی حیثیت میں اپنی ذہانت اور دلچسپی کے مطابق بھرپور زندگی گذار سکیں ۔

ج) تعلیمی پالیسی 1972ء تا 1980ء

اس پالیسی میں درج ذیل تعلیمی مقاصد بیان کیے گئے ۔

1 - پاکستان کے بنیادی نظریے کے تحفظ ، ارتقاء اور اس پر عمل کو یقینی بنانا اور اسے انفرادی اور قومی زندگی کا ضابطۂ حیات بنانا ۔

2 - معاشرتی اور ثقافتی ہم آہنگی کے ارتقاء کی بنیاد پر ، جو ہمارے بنیادی نظریے کے مطابق ہو ، تعلیمی عمل کے دانستہ استعمال کے ذریعے قومی یکجہتی و اتحاد کی تعمیر کرنا ۔

3 - افراد کی مکمل شخصیت کی اس انداز سے تعمیر اور نشوونما کرنا کہ افراد متحرک ، بااخلاق اور حقیقت کا سامنا کرنے کی بھرپور صلاحیت سے مزین ہوں اور حقائق کو معروضی انداز میں پرکھ سکیں ۔ یعنی ایسے افراد جو تکنیکی اور معاشرتی تبدیلیوں کا فہم و ادارک کر سکیں اور معاشرے کی اصلاح کے لیے تڑپ رکھتے ہوں ۔

4 - نوجوانوں میں معاشرتی خدمت اور ماحول کی اصلاح کے پروگراموں میں شرکت کے ذریعے قائدانہ کردار ادا کرنے کی تحریک پیدا کرنا اور محنت کی عظمت جاگزیں کرنا ۔

د) قومی تعلیمی پالیسی 1978ء

اس پالیسی کے تحت تعلیم کے درج ذیل بنیادی مقاصد مقرر کیے گئے ہیں ۔

1 - پاکستان کے عوام اور خصوصاً طلبہ کے دل و دماغ میں اسلام اور پاکستان کے لیے گہری اور دیرپا وفاداری اور اپنے روحانی اور نظریاتی تشخص کا پختہ شعور پیدا کرنا تاکہ انصاف

اور رواداری کے مطابق پاکستان کے عوام کے نقطۂ نظر میں اتحاد و یکجہتی کو استحکام حاصل ہو سکے ۔

2- ہر طالب علم میں یہ شعور پیدا کرنا کہ وہ پاکستانی قوم کا رکن ہونے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی امت مسلمہ کا حصہ بھی ہے اور یہ کہ اس سے وہ توقع کی جاتی ہے کہ نہ صرف کرۂ عرض پر بسنے والے تمام برادر مسلمانوں کی بہبود کے کاموں میں حصہ لے گا بلکہ دنیا بھر میں اسلام کا پیغام پہنچانے کی کوششوں میں مدد کرے گا ۔

3- ایسے شہری تیار کرنا جو تحریک پاکستان اور پاکستان کی نظریاتی بنیادوں ، تاریخ اور ثقافت سے مکمل طور پر واقف ہوں تاکہ وہ اپنے ورثے پر فخر کریں اور اسلامی مملکت کی حیثیت سے اپنے ملک کے مستقبل پر بھر پور اعتماد رکھتے ہوں ۔

4- قرآن و سنت کے مطابق ایسی سیرت اور کردار کی تشکیل کرنا اور اسے نشوونما دینا جن کی ایک سچے مسلمان سے توقع کی جا سکتی ہے ۔

5- پاکستان کے تمام شہریوں کے لیے تعلیم کے یکساں مواقع مہیا کرنا اور ان کا تیقن کرنا اور اقلیتوں کے لیے ان کی ثقافتی اور مذہبی ترقی کی خاطر مناسب سہولتوں کا انتظام کرنا تاکہ وہ بھی قومی اور اجتماعی جدوجہد میں مؤثر طور پر حصہ لے سکیں ۔

6- افراد کو ایسی موزوں تعلیم مہیا کرنا اور ان کی ایسی نشوونما کرنا جس کے ذریعے وہ اپنی انفرادی قابلیتوں کو مکمل طور پر تربیت اور باز تربیت کے ذریعے نشوونما دے سکیں اور افراد کی تخلیقی اور تجدیدی استعداد کو اس طرح ترقی دینا کہ وہ اسلامی نظام اقدار کی حدود میں رہتے ہوئے معاشرتی ، فطری اور پیداواری توانائیوں کی مؤثر انداز میں تعمیر کر سکیں اور انھیں استعمال کر سکیں ۔

7- عقیدے نسل اور ذات کی تفریق کا لحاظ رکھے بغیر شہریوں اور خاص طور پر نوجوانوں کے لیے کم از کم قابل قبول سطح تک عملی خواندگی اور بنیادی تعلیم مہیا کرنا تاکہ وہ قوم کی اجتماعی کوششوں میں مؤثر طور پر حصہ لے سکیں ۔

8- نوجوانوں میں تعلم (آموزش) اور نظم و ضبط کے لیے شوق اور محبت پیدا کرنا اور ہر طالب علم میں اس احساس کا یقین کرنا کہ وہ سمجھ سکیں کہ تعلیم ایک مسلسل اور

زندگی بھر جاری رہنے والا عمل ہے ۔

9- ملک میں سائنسی ، فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم ، تربیت اور تحقیق کو فروغ دینا اور مستحکم بنیادوں پر استوار کرنا اور اس علم کو معاشی و معاشرتی نمو اور ترقی میں استعمال کر کے خود کفالت حاصل کرنا اور ملک کے مستقبل کو محفوظ بنانا ۔

مقاصدِ تعلیم کا تجزیہ

مختلف ادوار میں جو مقاصد تعلیم متعین کیے گئے اگر ان پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ تعلیم کے مقاصد مقرر کرنے کے سلسلے میں ارتقائی عمل جاری رہا ہے ۔ ابتدا میں تعلیم کے مقاصد بڑے مبہم اور غیر واضح انداز میں بیان کیے گئے ۔ لیکن وقت کے تغیر کے ساتھ ہی ان کے تعین میں وضاحت و صراحت آتی گئی اور بالآخر 1979ء میں جو مقاصد مقرر کیے گئے وہ 1947ء اور 1959ء کے مقابلہ میں زیادہ معین واضح اور صریح ہیں ۔ تاہم ان سب ادوار میں مقرر کیے گئے مقاصد میں نظریۂ پاکستان اور اسلامی تعلیمات کو ترجیح دی جاتی رہی ۔ 1978ء کی پالیسی میں بیان کردہ مقاصد میں بنیادی طور پر اس بات کا اقرار کیا گیا کہ تعلیم کا اساسی نصب العین اسلام کے اصولوں کی ترویج و اشاعت اور افراد کے کردار و سیرت میں ان اصولوں کو جاگزین کرنا ہے ۔ اس پالیسی کے مقاصد میں اسلام کو صرف انفرادی زندگی کا ضابطہ ہی قرار نہیں دیا گیا بلکہ اس بات پر زور دیا گیا کہ مسلمانان پاکستان اسلام کی اشاعت اور تبلیغ کا فریضہ بھی انجام دیں گے ۔ اور امت مسلمہ کے رکن کی حیثیت میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں گے ۔ اس سے قبل کی تعلیمی پالیسیوں میں اگر اسلام یا نظریۂ پاکستان کا ذکر کیا گیا تو یہ بھی تبرکاً کیا گیا اور یہ طے نہیں کیا گیا کہ تعلیم کا کام سچے ، پکے اور پرعزم مسلمان پیدا کرنا ہے ۔ جو ہر کام رضائے الٰہی اور استحکام پاکستان کی خاطر انجام دیں گے ۔

ابتدائی تعلیم

کسی بھی نظام تعلیم میں ابتدائی تعلیم کو سنگ بنیاد کی حیثیت حاصل ہے ۔ ابتدائی تعلیم کے ذریعے فرد کو ایسی بنیادی معلومات ، بنیادی مہارتوں اور بنیادی رویوں کی تربیت دی جاتی ہے جو معاشرے میں ایک مفید شہری کے طور سے زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہیں ۔ ان معلومات ، مہارتوں اور رویوں کے تعین میں نفسیاتی اصولوں اور عصری تقاضوں کے علاوہ معاشرے کے نظریے اور اس کی ضرورتوں ، اس کے مسائل اور اس کے وسائل کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے ۔ ان سب حوالوں سے ابتدائی تعلیم کے دورانیے کا تعین کیا جاتا ہے ۔

ہمارے ملک میں آزادی کے وقت 1947 ء میں ابتدائی تعلیم کا دورانیہ چار سال کا تھا ۔ 1947 ء کی آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا کہ یہ دورانیہ پانچ سال کا ہو ۔ جلد ہی اسے چھ سال کا اور پھر بتدریج بڑھا کر آٹھ سال کا کر دیا جائے ۔ عملاً ہمارے ہاں اب تک ابتدائی تعلیم کا دورانیہ پانچ سال ہے جو پانچ سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے اور دس سال کی عمر تک جاتا ہے ۔

ابتدائی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد عملی خواندگی کا حصول ہوتا ہے ۔ اس معاملے میں ہمارا ملک ابھی تک بڑا پس ماندہ ہے ۔ 56-1951 ء کے شش سالہ تعلیمی منصوبے میں ناخواندگی کے خاتمے کا پروگرام شامل کیا گیا تھا ۔ اس سلسلے میں تعلیم بالغاں پر بھی بڑا زور دیا گیا اور اس مقصد کے لیے تعلیم بالغاں کے اساتذہ کے لیے خصوصی تربیت کی ضرورت واضح کی گئی ۔ تعلیم بالغاں کا دورانیہ چار ماہ کا تجویز کیا گیا تھا اور اس حساب سے سالانہ 28 لاکھ افراد کو خواندہ بنانے کا منصوبہ پیش کیا گیا تھا ۔

قومی تعلیمی کمشن 1959 ء نے خواندگی کے باب میں کچھ زیادہ توقعات وابستہ کر لی تھیں ۔ یعنی دس سال کے عرصے میں پانچ سال اور پندرہ سال کے عرصے میں آٹھ سال کی ابتدائی تعلیم کو لازمی بنیادوں پر نافذ کرنا ۔ یہ آرزو تو ابھی تک حسرت نا تمام سے آگے نہیں بڑھ سکی لیکن اصولاً اس کی ضرورت و اہمیت کے متعلق کمیشن نے جن تصورات کا اظہار کیا تھا انھیں آج بھی عملی منصوبہ بندی کی بنیاد بنایا جانا ضروری ہے ۔ کمیشن نے ابتدائی تعلیم کی توسیع کے لیے "کم خرچ بالا نشیں" کا مشہور عام نسخہ تجویز کیا تھا ۔ کمیشن نے سفارش کی تھی کہ پرائمری سکولوں کی عمارت اور فرنیچر کو سادہ رکھا جائے تاکہ خرچ میں بچت ہو ۔ اس سلسلے میں مقامی آبادی کی ضروریات اور وسائل کا لحاظ رکھنے پر زور دیا گیا اور سفارش کی گئی کہ عمارت اور فرنیچر کے اخراجات کا بار مقامی آبادی کو قبول کرنا چاہیے ۔ اس سلسلے میں حسب ضرورت سرکاری گرانٹ کی گنجائش رکھی گئی تھی ۔ سکولوں کی دیکھ بھال کے مسلسل اخراجات کے بارے میں سفارش پیش کی گئی تھی کہ ان میں سے نصف تو حکومت برداشت کرے اور باقی نصف کے لیے تعلیمی ٹیکس لگایا جائے ۔

1970 کی تعلیمی پالیسی میں پانچ سال کی ابتدائی تعلیم کو 1980 ء تک عام کرنے کے لیے ہدف طے کیا گیا تھا ۔ پرائمری سکولوں کے لیے مادی سہولیات کے متعلق اس پالیسی میں سفارش کی گئی تھی کہ ہر سکول میں کم از کم تین کمرے ہونے چاہئیں اور ان میں پرائمری کی پانچ جماعتوں کی تدریس کو دو شفٹوں میں منظم کیا جانا چاہیئے ۔ اس پالیسی میں ابتدائی تعلیم کے نصابات کو دلچسپ اور مفید بنانے کی سفارش کی گئی تھی ۔

1972-80 ء کی تعلیمی پالیسی میں ناخواندگی کے خاتمے اور تعلیم عامہ کے اہتمام پر بڑا زور دیا گیا تھا ۔ پالیسی میں ابتدائی تعلیم ، تعلیم بالغاں اور تعلیم عامہ پر الگ الگ باب لکھے گئے تھے ۔ 1982 ء تک لڑکوں کے لیے اور 1987 ء تک لڑکیوں کے لیے آٹھویں جماعت تک کی تعلیم عام کرنے کا عزم ظاہر کیا گیا تھا ۔ اس پالیسی میں طے شدہ پروگرام کے مطابق یکم اکتوبر ، 1972 ء سے آٹھویں جماعت تک فیس ختم کر دی گئی ۔ مرحلہ وار بنیاد پر طلبہ کے لیے درسی کتب اور سٹیشنری بھی مفت فراہم کرنے کی سفارش کی گئی تھی ۔ پہلی جماعت کے بچوں کے لیے قاعدہ مفت فراہم کرنے کا تجربہ کیا گیا لیکن جلد ہی اسے ختم کر دیا گیا ۔

پرائمری سکولوں کی لائبریریوں کے لیے موزوں تدریسی سامان ، تعلیمی کھلونے اور ریڈیو سیٹ فراہم کرنے اور جہاں ٹیلی کاسٹنگ کی سہولت میسر ہو وہاں ہر سکول میں ٹی وی سیٹ فراہم کرنے کو بھی پالیسی پروگرام کا حصہ بنایا گیا تھا ۔ لیکن اس پر کبھی عمل نہیں ہوا ۔ سکولوں کی عمارات کے اخراجات میں کفایت کے نقطۂ نظر سے اس پالیسی میں سفارش کی گئی تھی کہ یونین ہالوں ، کمیونٹی سنٹروں اور مقامی آبادی میں موجود دیگر موزوں عمارات کو پرائمری سکولوں کے طور پر استعمال کیا جائے نیز سکولوں کو ڈبل شفٹ کی بنیاد پر چلایا جائے ۔ اس پالیسی میں تعلیم بالغاں پر بھی بڑا زور دیا گیا تھا ۔ عام سکولوں کے علاوہ فیکٹریوں ، فارموں ، یونین ہالوں اور دیگر معاشرتی عمارات کو مراکز تعلیم بالغاں کے طور سے استعمال کرنے کی سفارش پیش کی گئی تھی ۔

1978-79 ء کی قومی تعلیمی پالیسی میں ابتدائی تعلیم کو عام کرنے کے لیے رسمی طریق تعلیم کے ساتھ چند نیم رسمی منصوبے بھی تجویز کیے گئے ہیں ۔ لیکن عملی اعتبار سے اس پالیسی کے ہدف بھی گزشتہ پالیسیوں کی طرح کچھ زیادہ بلند آہنگ معلوم ہوتے ہیں ۔ مثلاً پالیسی میں کہا گیا تھا کہ **1986-87** تک لڑکوں کے لیے اور **1992** ء تک لڑکیوں کے لیے ابتدائی تعلیم کو عام کر دیا جائے گا ۔ لڑکوں کے بارے میں تو یہ خوش نما آرزو حسرت بن چکی ہے اور **1992** ء بھی کچھ زیادہ دور نہیں جب کہ لڑکیوں کے باب میں ہمارے ہاں ابتدائی تعلیم کی صورت حال لڑکوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ خراب ہے ۔

قومی تعلیمی پالیسی کا یہ فیصلہ بڑا خوش آئند ہے کہ یونیورسٹیوں کا خرچ وفاقی حکومت اٹھائے گی اور اس طرح صوبائی حکومتوں کو جو بچت ہوگی اسے ابتدائی تعلیم کی ترقی کے لیے استعمال کیا جائے گا ۔ وفاقی حکومت اس پالیسی کے مطابق یونیورسٹی تعلیم کا خرچ برداشت کر رہی ہے ۔ لیکن ابتدائی تعلیم کے فروغ میں اس کا فائدہ ابھی تحقیق طلب ہے ۔ اس پالیسی میں ابتدائی تعلیم کی ترقی کے لیے ایک اور اختراع یہ تجویز کی گئی تھی کہ پہلی سے تیسری جماعت تک کے بچوں کی تعلیم کے لیے مسجد سکول قائم کیے جائیں ۔ اس منصوبے پر محدود پیمانے

پر عمل کیا جارہا ہے اور اس کے نتیجے میں بہتر نتائج کی توقع ہے ۔ رسمی سکولوں میں تعلیم کے لیے نہ جا سکنے والی لڑکیوں کے لیے قرآن پاک ، اسلامیات اور امور خانہ داری کی بنیادی تعلیم کے لیے محلہ سکولوں کا قیام بھی اس پالیسی کا ایک اختراعی منصوبہ ہے ۔ اس پر عمل درآمد ہو جائے تو یہ لڑکیوں میں خواندگی کے فروغ کا باعث بن سکتا ہے ۔ اسی طرح اگر دیہی ورکشاپ کے منصوبے پر عمل ہو جائے تو رسمی تعلیم سے محروم لڑکوں کو دیہی معیشت اور پیشوں کے لیے مناسب ماحول ، بنیادی حرفتی تربیت اور عام خواندگی فراہم کرنے میں مدد مل سکتی ہے ۔

ثانوی تعلیم

1951 ء کی تعلیمی پالیسی میں منظور شدہ تعلیمی منصوبہ پہلی دستاویز ہے جس میں ثانوی تعلیم کے فروغ کو موضوع بنایا گیا تھا ۔ اس منصوبے میں **721** نئے ثانوی سکول قائم کرنے کا پروگرام بنایا گیا تھا نیز بہتر عملے ، بہتر عمارات اور بہتر سازو سامان کی فراہمی کو بھی منصوبے میں شامل کیا گیا تھا ۔

ثانوی تعلیم کے متعلق سب سے زیادہ مفصل سفارشات قومی تعلیمی کمیشن کی رپورٹ میں پیش کی گئی تھیں ۔ کمیشن نے ثانوی تعلیم کو یونیورسٹی تعلیم سے الگ علمی اور انتظامی یونٹ قرار دینے پر زور دیا ۔ کمیشن نے ثانوی تعلیم کا مقصد یہ قرار دیا کہ بچہ اس تربیت کے نتیجے میں معاشی تبدیلیوں اور سائنسی ترقیوں کا فہم و تحسین حاصل کر سکے اور معاشی اعتبار سے مفید فعالیتوں میں حصہ لے سکے ۔ اس غرض کے لیے سکولوں میں اضافی کمروں ، لیبارٹریوں ، ورکشاپوں ، لائبریریوں ، قطعات باغبانی ، کھیل کے میدانوں اور دیگر سازو سامان کی فراہمی پر زور دیا گیا اور اس سلسلے میں حکومت اور نجی سیکٹر کے تعاون کی اہمیت واضح کی گئی ۔

نئی تعلیمی پالیسی 1970ء میں ثانوی تعلیم کی تشکیل نو کے سلسلے میں سفارش کی گئی کہ تعداد طلبہ کے اعتبار سے آرٹس میں 40 فی صد اور سائنس، صنعتی مضامین اور حرفتی تعلیم میں 60 فیصد کا تناسب قائم رکھا جائے۔

تعلیمی پالیسی 80-1972ء میں ثانوی تعلیم اور انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کے ایک ہی باب میں سفارشات پیش کی گئی تھیں۔ اس پالیسی میں آرٹس، سائنس اور صنعتی مضامین میں تعداد طلبہ کا تناسب بالترتیب 36 فیصد، 30 فیصد اور 33 فیصد کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔ اس مقصد کے لیے پالیسی مدت 80-1972ء کے دوران میں طلبہ کے لیے تدریسی سہولتوں میں اضافے کا پروگرام بھی پیش کیا گیا تھا۔ پالیسی کے مجوزہ پروگرام کے مطابق توقع تھی کہ تعداد طلبہ 5/6 لاکھ سے بڑھ کر 12 لاکھ ہو جائے گی اور یوں متعلقہ عمر کے 15 فیصد افراد شامل تعلیم ہو جائیں گے۔

قومی تعلیمی پالیسی 1979ء میں ثانوی تعلیم کو نویں سے بارہویں جماعت تک پر مشتمل قرار دیا گیا ہے۔ چھٹی ساتویں اور آٹھویں کو ابتدائی تعلیم میں شامل کیا گیا ہے۔ پالیسی بیان میں طلبہ کو مضامین کے انتخاب کے مواقع فراہم کرنے کے لیے مزاج کے مطابق نصابی مضامین میں تنوع کے اہتمام پر زور دیا گیا ہے۔ ایگرو ٹیکنیکل مضامین کو ضروری اصلاح کے بعد مرحلہ وار بنیادوں پر تمام سکولوں میں نافذ کرنے کا پروگرام پیش کیا گیا ہے۔ پالیسی میں ایک ہزار مڈل سکولوں کو ہائی سکولوں میں تبدیل کرنے اور 200 نئے ثانوی سکول کھولنے کا پروگرام پیش کیا گیا۔ اس طرح پانچ سال کے عرصے میں تعداد طلبہ 18 لاکھ سے بڑھ کر 28 لاکھ ہونے کا تخمینہ پیش کیا گیا ہے۔ تعلیمی سہولتوں میں اضافے اور اساتذہ کے لیے رہائشی سہولتوں کی فراہمی کی بھی سفارش کی گئی ہے۔ تعداد طلبہ کے مطابق حسب ضرورت سکولوں

میں ڈبل شفٹ شروع کرنے کا پروگرام بھی بنایا گیا ہے ۔ ثانوی تعلیم کے دائرہ کار میں ایسی وسعت کا عزم ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ سطح خود مکتفی ہو جائے اور طالب علم اس کی بنا پر بغیر کسی مزید فنی تربیت کے پیداواری سرگرمیوں میں حصہ لے سکے ۔

اعلیٰ تعلیم

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس 1947ء میں تشکیل کردہ یونیورسٹی ایجوکیشن کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں جو سفارشات پیش کی تھیں وہ نظام تعلیم کی عمومی اصلاح و تشکیل کے لیے تو بلاشبہ بڑی مفید تھیں لیکن اعلیٰ تعلیم کی اصلاح و ترقی کے لیے اس کمیٹی کی رپورٹ میں براہ راست کوئی سفارشات شامل نہ تھیں ۔

1951ء کی تعلیمی کانفرنس میں منظور شدہ تعلیمی منصوبے میں اعلیٰ تعلیم کے متعلق خاصا مفصل پروگرام بنایا گیا تھا ۔ 1951ء میں پاکستان میں کل 127 انٹر کالج ، 82 ڈگری کالج اور 9 پوسٹ گریجوٹ کالج تھے ۔ برصغیر کی کل اکیس یونیورسٹیوں میں سے پاکستان کے حصے میں صرف پنجاب یونیورسٹی ، سندھ یونیورسٹی اور ڈھاکہ یونیورسٹی آئی تھیں ۔ 1951ء تک مزید دو یونیورسٹیاں قائم ہوئی تھیں یعنی پشاور یونیورسٹی اور کراچی یونیورسٹی ۔ ان تمام یونیورسٹیوں میں حسب ضرورت اہل اساتذہ دستیاب نہ تھے اور عمارتیں ، لائبریریاں اور لیبارٹیاں بھی معیاری نہ تھیں ۔ شش سالہ تعلیمی منصوبے میں چار نئے انٹر کالج ، چھ ڈگری کالج اور دس ہوسٹل قائم کرنے کے علاوہ ایک نئے پوسٹ گریجویٹ کالج کے قیام کا پروگرام بھی بنایا گیا تھا ۔ پہلے سے موجود یونیورسٹیوں کی ترقی کے لیے بھی منصوبے میں خاصی بڑی رقم مختص کی گئی تھی ۔

قومی تعلیمی کمشن 1959ء کی رپورٹ میں تربیت کے اعتبار سے اعلیٰ تعلیم کو پہلے نمبر پر رکھا گیا تھا اور اہم سفارشات پیش کی گئی تھیں ۔ ان میں ایک سفارش یہ تھی کہ انٹرمیڈیٹ کلاسوں کو یونیورسٹی تعلیم سے الگ کر کے ثانوی بورڈ کے دائرۂ کار میں شامل کیا جائے اور بی اے / بی ایس سی حسب سابق دو سال کا ہو ۔ پی ایچ ڈی کا کم از کم دورانیہ دو سال تجویز کیا گیا تھا ۔ نصابات کو عصری تقاضوں اور ملکی ضروریات کے مطابق ڈھالنے پر زور دیا گیا تھا اور اس حوالے سے خصوصاً سائنسی اور تکنیکی مضامین کے نصابات پر نظر ثانی کی سفارش کی گئی تھی ۔ زباندانی کی تربیت پر زور دینے اور اعلیٰ لسانی تربیت کے لیے ایک انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز قائم کرنے کی سفارش پیش کی گئی تھی ۔

پاکستان کے مختلف علاقوں میں اعلیٰ تعلیم میں ربط و ارتباط کے اہتمام کے لیے کمیشن نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے قیام کی سفارش کی تھی ۔

کمیشن برائے مسائل و بہبود طلبہ نے 1966ء میں اعلیٰ تعلیم کے ضمن میں ایک سفارش یہ پیش کی کہ مرحلہ وار پروگرام کے ذریعے ڈگری کالجوں میں پوسٹ گریجویٹ کلاسیں جاری کی جائیں ۔ کالجوں کے نظم و نسق کے سلسلے میں کمیشن کی سفارشات درج ذیل تھیں ۔

1 - یونین فنڈ کو صرف اس کے مخصوص مقاصد کے لیے خرچ کیا جائے ۔
2 - کالجوں کے لیے کافی رقوم مہیا کی جائیں ۔
3 - لیبارٹریوں کے بریکیج فنڈ کے خرچ کا اختیار پرنسپل کو دیا جائے ۔
4 - بجٹ کی حدود میں رہتے ہوئے پرنسپل کو بجٹ کے خرچ کا پورا اختیار دیا جائے ۔
5 - عارضی بنیادوں پر متعین اساتذہ کو بشرط موزونیت مستقل کر دیا جائے ۔
6 - غیر ملکی یونیورسٹیوں سے ایم اے / ایم ایس سی کی ڈگری لینے والوں کو چار زائد ترقیاں دی جائیں ۔

7- کالجوں کے ساتھ کم از کم 50 فیصد سٹاف کے لیے رہائشی کوارٹر فراہم کیے جائیں ۔

اس کمیشن نے پرائیویٹ کالجوں کے نظم و نسق کے متعلق بھی متعدد سفارشات پیش کی تھیں ۔ ان میں سے اہم ترین سفارش یہ تھی کہ ایسے کالجوں کے پرنسپلوں کا تقرر پرائیویٹ انتظامیہ کے بجائے ایک کمیٹی کے سپرد کیا جائے جس کا چیئرمین پبلک سروس کمیشن کا چیئرمین ہو ۔

1970ء کی تعلیمی پالیسی میں اس امر پر زور دیا گیا تھا کہ جدید دور میں "مادی اور اخلاقی" بہبود کے لیے اعلیٰ تعلیم کا معیاری ہونا بے حد ضروری ہے ۔ پالیسی میں مخصوص علمی اور پیشہ ورانہ شعبوں میں معیار تعلیم کی اصلاح کے لیے ڈاکٹریٹ اور پوسٹ ڈاکٹریٹ مطالعہ و تحقیق کے اہتمام کی سفارش کی گئی تھی ۔ مختلف یونیورسٹیوں میں مختلف علوم و فنون کے مراکز کمال (Centres of Excellence) قائم کرنے کی سفارش کی گئی تھی ۔ اعلیٰ تعلیم کی بڑھتی ہوئی ضرورت کے مطابق اور علاقائی ضرورت کے حوالے سے نئی یونیورسٹیاں اور نئے کالج قائم کرنے کی سفارش بھی پالیسی میں شامل تھی ۔

اس پالیسی میں اعلیٰ سطح کے اساتذہ کے لیے ان کی قابلیت کے حوالے سے بہتر سکیلوں کے تعین کی سفارش کی گئی تھی ۔ اساتذہ کے لیے تصنیف و تالیف کی سہولت کے نقطۂ نظر سے رخصت کی سفارش کی گئی تھی ۔ نیز ان کے لیے رہائشی سہولتیں فراہم کرنے پر زور دیا گیا تھا ۔

1972-80ء کی تعلیمی پالیسی میں 1980ء تک مزید ایک لاکھ طلبہ کے لیے اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم کیے جائیں گے ۔ اس سلسلے میں سائنس میں دس فیصد اور آرٹس میں پانچ فیصد نشستوں کے اضافے کا پروگرام بنایا گیا تھا اور جامعہ اسلامیہ بہاولپور کو مکمل یونیورسٹی کا درجہ دینے کی سفارش کی گئی تھی ۔ زرعی کالج ٹنڈوجام ، انجینئرنگ کالج پشاور کو یونیورسٹیوں کا درجہ دینا بھی اسی پالیسی کا حصہ تھا ۔

1979 ء کی تعلیمی پالیسی میں کالج کی تعلیم کو بارہویں سے سولہویں جماعت تک چار جماعتوں پر مشتمل قرار دیا گیا ہے ۔ اس پالیسی میں کالجوں کی ثقافتی زندگی کو مستحکم کرنے پر خاص زور دیا گیا ہے ۔ اس سلسلے میں اپنے کالج میں اور مختلف کالجوں کے مابین مباحثوں ، کھیلوں اور دوسری ثقافتی سرگرمیوں کو کالج کے اہم نصابی پروگرام میں نمایاں حیثیت دی گئی ہے ۔ رہنمائی و مشاورت کے پروگرام کی تنظیم کا تصور بھی پیش کیا گیا ہے ۔ اعلیٰ تعلیم کی اصلاح کے لیے درج ذیل پروگرام طے کیا گیا ہے ۔

1 - آئندہ پانچ سال کے دوران میں (یعنی 1985 ء تک) سوائے خواتین یونیورسٹیوں کے کوئی نئی یونیورسٹی قائم نہیں کی جائے گی ۔

2 - موجودہ مراکز کمال کو مستحکم بنایا جائے گا اور کم از کم پانچ مزید ایسے مراکز قائم کیے جائیں گے ۔

3 - بعض یونیورسٹیوں میں ڈاکٹریٹ اور پوسٹ ڈاکٹریٹ کے لیے سنٹرز آف ایڈوانسڈ سٹڈیز قائم کیے جائیں گے ۔

4 - تمام صوبوں کے منتخب گرلز کالجوں میں پوسٹ گریجویٹ کلاسیں شروع کی جائیں گی ۔

5 - یونیورسٹی گرانٹس کمیشن بی اے/بی ایس سی اور اس سے اعلیٰ تعلیم کے نصابات کی اصلاح کے لیے تحقیق کرے گا ۔

6 - لائبریری اور لیبارٹریوں کی اصلاح کی جائے گی ۔

7 - نیشنل اکیڈمی آف ہائر ایجوکیشن اساتذہ کے لیے قبل از ملازمت اور دوران ملازمت تربیت کا انتظام کرے گی ۔

تربیتِ اساتذہ

1947 ء کی پہلی آل پاکستان تعلیمی کانفرنس میں اساتذہ کی مناسب تربیت ، قلیل المدت تربیتی پروگراموں کی تنظیم اور اساتذہ کے لیے موزوں مشاہرے کے اہتمام کی سفارش کی گئی تھی ۔ پاکستان اکیڈمی کے نام سے تربیت اساتذہ کے ایک قومی ادارے کا قیام بھی

کانفرنس کی سفارشات میں شامل تھا۔

1951ء کی تعلیمی کانفرنس میں منظور شدہ شش سالہ منصوبے میں موثر تدریس پر بڑا زور دیا گیا تھا۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ سکولوں کے اکثر اساتذہ غیر تربیت یافتہ تھے۔ اس وقت اساتذہ کی تربیت کے اداروں کی تعداد بھی ناکافی تھی لہٰذا نئے تربیتی اداروں کے قیام اور دوران ملازمت تربیت کے تین تین ماہ کے کورسوں کا پروگرام منصوبے میں شامل کیا گیا۔

1959ء کے قومی تعلیمی کمیشن کی رپورٹ میں اساتذہ کی تربیت و حالات کار پر پورا باب شامل تھا۔ اس میں چھٹی سے آٹھویں جماعت تک کے اساتذہ کے لیے ایف اے/ایف ایس سی اور نویں دسویں جماعت کے اساتذہ کے لیے بی اے/بی ایس سی کو بنیادی قابلیت داخل قرار دیا گیا۔ گیارھویں بارھویں میں تدریس کے لیے ایم اے/ایم ایس سی کو بنیادی علمی قابلیت قرادر دیا گیا۔ اس کے علاوہ مختصر المدت تدریسی کورس بھی تجویز کیے گئے۔ تربیتی کالجوں کے اساتذہ کی تربیت کے لیے مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان میں ایک ایک اعلیٰ تربیتی ادارہ قائم کرنے کی تجویز بھی کمیشن کی رپورٹ میں شامل تھی۔

1970ء کی تعلیمی پالیسی میں مروجہ تربیتی پروگراموں کے ساتھ ساتھ مختصر مدت کے خصوصی پروگراموں کو مہماتی انداز میں تشکیل دینے پر زور دیا گیا۔ اس کے علاوہ انٹر میڈیٹ اور ڈگری کی سطح پر علم التعلیم کو ایک انتخابی مضمون کی حیثیت سے شامل کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔

1972-80ء کی پالیسی میں علم التعلیم کی انتخابی مضمون کے طور سے تدریس کی مذکورہ بالا تجویز کی تائید کی گئی اور 1975ء میں اسے عملاً نافذ کر دیا گیا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں اساتذہ کے لیے تجدیدی تربیتی کورس منظم کرنے پر زور دیا گیا۔ اندرون ملک بہتر تربیت کے حصول کے لیے اساتذہ کو باتنخواہ رخصت کی سہولت کی سفارش پالیسی میں شامل ہے۔ اصلاحی پروگرام کے اہم نکات حسب ذیل ہیں۔

1 - تربیتی اداروں میں داخلے کے لیے باقاعدہ انٹرویو ہو جس میں نظریۂ پاکستان کے ساتھ وابستگی کو بنیادی اہمیت دی جائے ۔

2 - اساتذہ کو نظریۂ پاکستان اور ان کے خاص میدان علم میں خاص تجدیدی کورس فراہم کیے جائیں گے ۔

3 - پرائمری ٹیچرز کے تمام تربیتی اداروں کو کالجوں کا درجہ دے دیا جائے گا ۔

4 - تربیتی پروگراموں کا تحقیقی جائزہ لے کر ان میں اصلاح کی جائے گی ۔

5 - کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ کی قبل از ملازمت اور دوران ملازمت تربیت کے اہتمام کے لیے اکیڈمی آف ہائر ایجوکیشن کو مستحکم بنایا جائے گا ۔

6 - تعلیمی منصوبہ سازوں ، منتظمین اور نگرانوں کی تربیت کے لیے اکیڈمی آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ مینجمنٹ قائم کی جائے گی ۔

ٹیکنیکل تعلیم

1947ء کی تعلیمی کانفرنس میں صنعتی تعلیم کے فروغ پر بڑا زور دیا گیا تھا اور پاکستان میں ایک کونسل آف ٹیکنیکل ایجوکیشن کے قیام کی سفارش کی گئی تھی ۔ اس کونسل کے مجوزہ مقاصد حسب ذیل تھے ۔

1 - مختلف مدارج میں ٹیکنیکل تعلیم کے فروغ کے لیے سفارشات پیش کرنا ۔

2 - پاکستان میں ٹیکنیکل تعلیم کی سہولتوں کا سروے کرنا اور کمی کو پورا کرنے کی تجاویز پیش کرنا ۔

3 - ٹیکنیکل تعلیم کے تمام مدارج اور تمام پہلوؤں میں ترقی اور تشکیل نو کی جامع سکیم تیار کرنا ۔

4 - ملک کے اندر اور باہر ٹیکنیکل مضامین کے سکالروں کے لیے پانچ سالہ تربیتی سکیم تیار کرنا اور اس سکیم کے نفاذ کے وسائل تجویز کرنا ۔

1951ء کی تعلیمی کانفرنس میں ٹیکنیکل تعلیم کی ایسی تنظیم نو کی سفارش کی تھی

جس سے ٹیکنیکل تعلیم جنرل تعلیم کا لازمی حصہ بن جائے ۔ تجارتی تعلیم کے فروغ کے لیے تجارتی تعلیم کی تنظیم نو کمیٹی نے الگ سے تجاویز پیش کی تھیں ۔ 1951ء میں پاکستان میں کل آٹھ کمرشل سکولوں میں تعداد طلبہ 614 تھی ۔ شش سالہ منصوبے میں مزید 12 کمرشل سکول اور ایک انسٹی ٹیوٹ آف کامرس قائم کرنے کا پروگرام بنایا گیا تھا ۔

قومی تعلیمی کمیشن 1959ء نے سفارش کی کہ ٹیکنیکل تعلیم کو عام تعلیم کے ساتھ چھٹی سے آٹھویں جماعت تک طلبہ کو کوئی نہ کوئی حرفت بھی سکھائی جائے ، آٹھویں جماعت کے بعد دسویں جماعت تک کے نصاب میں ایک حرفتی مضمون بھی شامل کیا جائے جسے منتخب طلبہ اپنی آزاد مرضی سے اختیار کر سکیں ۔ دسویں جماعت کے بعد پولی ٹیکنک انسٹی ٹیوٹ اور ٹیکنیکل کالجوں کا جداگانہ نظام اور نصاب ہو جسے طلبہ اپنی اپنی ضرورت اور دلچسپی کے مطابق اختیار کر سکیں ۔ کمیشن نے مروجہ حرفتی سکولوں کے نصاب میں اصلاح کے ضمن میں سفارش کی کہ ان اداروں کے نصاب کا پچاس فیصد جنرل تعلیم پر مشتمل ہو ۔ کمیشن کی سفارشات کے نتیجے میں ٹیکنیکل تعلیم کی موثر تنظیم کے لیے صوبائی سطح پر ٹکینیکل تعلیم کے جداگانہ ڈائریکٹریٹ قائم کر دیے گئے ۔ 1970ء کی تعلیمی پالیسی میں اظہار کیا گیا تھا کہ کل تعداد طلبہ میں ٹیکنیکل تعلیم کا تناسب صرف 4 فیصد ہے ۔ پالیسی میں سفارش کی گئی کہ آئندہ داخلہ پالیسی میں ٹیکنیکل تعلیم کا تناسب 60 فیصد کر دیا جائے ۔

1972-80ء کی تعلیمی پالیسی میں ٹیکنیکل ایجوکیشن کے پروگرام کی اصلاح اور اس کے وقار کی بلندی کے لیے فیصلہ کیا گیا کہ پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹوں کو ٹیکنیکل کالجوں کا درجہ دے دیا جائے گا ۔ چیدہ چیدہ ٹیکنیکل کالجوں میں ایم ٹیک کا ڈگری پروگرام شروع کرنے کی سفارش کی گئی ۔ پالیسی میں عام سکولوں اور کالجوں میں ٹیکنیکل تعلیم کے مواقع فراہم کرنے کی غرض سے میٹرک انڈسٹریل آرٹس ، میٹرک زراعت ، ایف ایس سی زراعت ، ایف ایس سی بزنس اور بی ایس سی ایجوکیشن کے پروگرام منظم کرنے کی سفارش پیش کی گئی تھی ۔

1979ء کی تعلیمی پالیسی میں ٹیکنیکل ایجوکیشن کی اصلاح کا درج ذیل پروگرام شامل تھا ۔

1- چھٹی سے آٹھویں جماعت تک کے نصابات میں پیداواری انداز پر زور دیا جائے گا ۔

2- ٹیکنیکل ایجوکیشن کے بورڈوں اور ڈائریکٹریٹوں کو اس طرح از سر نو منظم کیا جائے گا کہ ایڈوائزری کمیٹیوں میں صنعت و تجارت کے نمائندگان بھی شامل ہو سکیں ۔

3- تجرباتی بنیاد پر چیدہ چیدہ ٹیکنیکل اداروں کے ساتھ پیداواری یونٹ ملحق کیے جائیں گے ۔

4- تکمیل کے بغیر تعلیم چھوڑ جانے والوں کے لیے الگ ٹیکنیکل ادارے قائم کیے جائیں گے جیسے لڑکوں کے لیے ویلیج ورکشاپ اور لڑکیوں کے لیے محلہ سکول ۔

5- انٹر بورڈ ٹیکنیکل ایجوکیشن کمیٹی تشکیل دی جائے گی ۔ جو غیر رسمی اور نیم رسمی انداز میں حاصل شدہ ٹیکنیکل تربیت کا مناسب جائزہ لے کر سندات جاری کر سکے گی ۔

6- ٹیکنیکل ٹیچرز کو صنعت کے میدان میں اپنی خدمات بروئے کار لانے کی اجازت ہوگی اور اسی طرح صنعتی میدان سے تجربہ کار ٹیکنیشنوں کی خدمات سے تعلیمی اداروں میں استفادہ کیا جائے گا ۔

7- ٹیکنیکل ٹیچرز کی قبل از ملازمت اور دوران ملازمت تربیت کے انتظام کے لیے ایک کالج فار ٹیکنیکل ایجوکیشن قائم کیا جائے گا ۔

مشقی سوالات

1- مطالبۂ پاکستان کی وجوہات کیا تھیں ؟

2- نظریۂ پاکستان کو نصاب میں کس طرح سمویا جا سکتا ہے ؟

3- نظریۂ حیات انسانی معاشرے کے لیے کیوں ضروری ہے ؟

4- دسویں جماعت کی کسی ایک کتاب کا جائزہ لے کر لکھیے کہ اس میں نظریۂ پاکستان کی کس حد تک عکاسی کی گئی ہے ؟

5- ہمارے مقاصد تعلیم کیا ہیں ؟ پاکستان کی تعلیمی پالیسیوں کے حوالے سے بیان کریں ۔

6- درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب لکھیے ۔

الف ۔ افراد کی افرادی و اجتماعی ضرورتیں کیا ہیں۔

ب ۔ تعلیم کے وہ کون سے مقاصد ہیں جو ہمیشہ برقرار رہتے ہیں ؟

ج ۔ تعلیمی کمیشن 1959 ء میں تعلیم کے کیا مقاصد بیان کیے گئے ہیں ۔

د ۔ پاکستان کے استحکام کی خاطر تعلیم کو کیا کردار ادا کرنا چاہیے ۔

ہ ۔ قومی تعلیمی پالیسی 1979 ء میں بیان کردہ مقاصد میں کن امور پر زور دیا گیا ہے ؟

7- موزوں ترین جواب منتخب کر کے اس کے سامنے صحیح (✓) کا نشان لگائے ۔

i) نظریہ سے مراد ہے :

الف) وہ روایات جن پر لوگ عمل کر رہے ہوں ۔

ب) جماعت یا گروہ کا مل جل کر رہنا ۔

ج) عقائد و افکار اور اقدار کا منضبط نظام جسے لوگ اجتماعی زندگی کا لائحہ عمل بنا لیں ۔

د) دنیا و مافیہا کے بارے میں ایک تصور ہے ۔

ii) مسلمانوں نے پاکستان کا مطالبہ اس لیے کیا کہ :

الف) وہ ایک الگ مستقل قوم تھے ۔

ب) ہندو ، غیر منقسم ہندوستان میں اکثریت میں تھے۔

ج) انگریز ، مسلمانوں کو غلام رکھنا چاہتے تھے ۔

د) وہ اپنی تہذیب ، تمدن اور اسلامی نظریۂ حیات کا تحفظ و نفاذ چاہتے تھے ۔

iii) نظریۂ پاکستان کا مرکزی نکتہ :

الف) دو قومی نظریہ ہے ۔

ب) مملکت میں اسلام کا نفاذ ہے ۔

ج) مسلمانوں کی اقتصادی ترقی ہے ۔

د) جمہوریت و معاشرتی انصاف کا قیام ہے ۔

iv) نظریۂ پاکستان کا اظہار 1973 ء کے آئین :

الف) کے دیباچہ (Preamble) میں کیا گیا ہے ۔

ب) میں بالکل نہیں کیا گیا ہے ۔

ج) کی شق نمبر 31 میں کیا گیا ہے ۔

د) کے باب "پالیسی کے اصول" میں کیا گیا ہے ۔

v) نظریۂ پاکستان کا بنیادی اثر تعلیم میں :

الف) اس کے مقاصد پر ہوتا ہے ۔

ب) نصاب پر پڑتا ہے ۔

ج) اساتذہ کی تربیت پر ہوتا ہے ۔

د) درسی کتب میں نفسِ مضمون کے انتخاب پر ہوتا ہے ۔

vi) تعلیم ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ بچّے :

الف) کو پڑھنا لکھنا سکھایا جاتا ہے ۔

ب) کے کردار میں موزوں اور پسندیدہ تبدیلیاں پیدا کی جاتی ہیں ۔

ج) میں پیداواری صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں ۔

د) میں اجتماعی زندگی گزارنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے ۔

(vii) معاشرے میں ، افراد وہی کام کر سکتے ہیں جنھیں تمام افراد معاشرہ اجتماعی طور پر پسندیدہ تسلیم کرتے ہوں ۔ کسی عمل کے پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہونے کا انحصار

الف) بنیادی انسانی ضرورتوں پر ہوتا ہے ۔

ب) افراد کی خوشی اور مسرت پر ہوتا ہے ۔

ج) اس قوم کے نظریۂ حیات پر ہوتا ہے ۔

د) اس قوم کے سیاسی و معاشی نظام پر ہوتا ہے ۔

8) 1947 ء سے 1979 ء تک ابتدائی تعلیم کی اصلاح اور فروغ کے لیے کیا کیا تجاویز منظر عام پر آئیں ۔

9- ثانوی تعلیم پر مفصل سفارشات کے لیے کون سی قومی تعلیمی دستاویز خاص طور سے نمایاں ہے ؟ اس کی سفارشات کی نشاندہی کیجیے ۔

10 - 1947ء سے 1979ء تک ثانوی تعلیم کی ترقی کا ایک دستاویزی جائزہ پیش کیجیے ۔

11 - قومی تعلیمی کمیشن نے تعلیم کے متعلق کیا سفارشات پیش کی تھیں ۔

12 - 1947ء سے 1979ء تک اعلیٰ تعلیم کی ترقی کا ایک دستاویزی جائزہ پیش کیجیے ۔

13 - 1947ء سے 1979ء تک تربیت اساتذہ اور ٹیکنیکل تعلیم کا جائزہ پیش کیجیے ۔

14 - 1979ء کی تعلیمی پالیسی میں کالجوں اور یونیورسیٹوں کی تعلیم کا کیا پروگرام پیش کیا گیا تھا ؟

15 - علم التعلیم کو کالجوں میں نافذ کرنے کا کیا مقصد تھا ؟ متعلقہ پالیسیوں کے حوالے سے بیان کریں ۔

16 - 1979ء کی تعلیمی پالیسی میں تربیت اساتذہ کے متعلق کیا پروگرام شامل تھا ؟

17 - قومی تعلیمی کمیشن نے ٹیکنیکل تعلیم کے فروغ کے لیے کیا کردار ادا کیا ؟

18 - 1972-80ء کی تعلیمی پالیسی میں ٹیکنیکل تعلیم کے متعلق کیا نئی سفارشات پیش کی گئیں ۔

19 - 1979ء کی تعلیمی پالیسی میں ٹیکنیکل تعلیم کی اصلاح کا کیا پروگرام شامل تھا ؟

20 - درج ذیل بیانات میں خالی جگہ کو پُر کیجیے ۔

- تعلیم کے مقاصد کی تشکیل میں ---- کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے ۔
- تعلیم کے ذریعے ---- کا انتقال ممکن ہو جاتا ہے ۔
- ---- تعلیم کے مقاصد کے حصول کو ممکن بنانے کے لیے متعین کیا جاتا ہے ۔
- پاکستان میں تعلیم کا نصب العین فرد کو ---- بنانا ہے ۔
- معاشرے کے تمام افراد اجتماعی طور پر ایک ---- اختیار کر لیتے ہیں تا کہ مل جل کر زندگی گزار سکیں ۔
- قائد اعظم نے پاکستان کو ---- مملکت قرار دیا تھا ۔
- مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد ---- نہیں ہے ۔

باب 5

پاکستان کے تعلیمی مسائل

ہم پاکستان میں اب تک تعلیمی لحاظ سے بہت مسائل میں الجھے ہوئے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیمی اعتبار سے تا حال ترقی یافتہ قوموں میں شمار ہونا تو درکنار ، ہم ترقی پذیر قوموں میں بھی بہت پیچھے ہیں ۔ یہ تعلیمی مسائل اتنے زیادہ اور گھمبیر ہیں کہ ان تمام مسائل کا ذکر ممکن نہیں اس لیے یہاں ہم درج ذیل چند اہم مسائل کا ہی ذکر کریں گے ۔

1) خواندگی
2) تعلیمِ نسواں
3) پیشہ ورانہ ضابطہ اخلاق
4) طلبہ میں نظم و ضبط
5) معیارِ تعلیم
6) تعلیم کے یکساں مواقع
7) تعلیم اور روزگار
8) ترکِ تعلیم

خواندگی

پاکستان دنیا کے ان ممالک میں شامل ہے جن میں شرح خواندگی بہت کم ہے ۔ اسی بناء پر ملک کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے ناخواندہ افراد ، بہت سے کاموں میں دوسرے افراد کے دست نگر ہیں ۔ ان کی معلومات کم ہیں جس کی وجہ سے وہ سیاسی ، سماجی اور اقتصادی امور میں بھرپور حصہ نہیں لے سکتے ۔ یہی وجہ ہے ۔ کہ ہم دنیا کی اقوام میں بہت پیچھے ہیں ۔

خواندگی کی تعریف

خواندگی سے عموماً افراد کی پڑھنے لکھنے کی ابتدائی صلاحیت مراد ہے ۔ اگر ایک شخص چھپے ہوئے الفاظ پڑھ سکتا اور انھیں اپنے ہاتھ سے لکھ سکتا ہو تو عام طور سے اسے خواندہ کہا جاتا ہے ۔ ہر ملک اور قوم میں خواندگی کا معیار مختلف ہوتا ہے ۔ یہ معیار اس قوم کی معاشرتی اور اقتصادی ترقی سے مربوط ہوتا ہے مثلاً امریکہ اور روس میں ایسے فرد کو خواندہ تصور کیا جاتا ہے جو پانچویں جماعت پاس طالبعلم کی سطح کے مطابق عبارت پڑھ سکے ، اس کے مفہوم کو سمجھ سکے اور اپنے خیالات لکھ کر بیان کر سکے ۔

ہمارے ملک میں ، مردم شماری کے وقت ، خواندہ افراد کی گنتی بھی کی جاتی ہے اور اس سلسلے میں خواندگی کے معیار کا تعین بھی کیا جاتا ہے ۔

1981 ء کی مردم شماری میں کسی اخبار میں چھپی ہوئی عبارت پڑھنے اور سادہ خط لکھنے کو خواندگی تسلیم کیا گیا ہے ۔

گو کہ خواندگی کی تعریفوں میں ابتدائی حساب شامل نہیں کیا گیا ہے تاہم خواندگی کے مفہوم میں اب یہ امر بھی شامل سمجھا جاتا ہے کہ ہر خواندہ فرد ابتدائی حساب سے بھی واقف ہو کیونکہ حساب کے ہندسے اور جمع تفریق وغیرہ بھی خواندگی کی علامات ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی طور پر پڑھنے لکھنے (Literacy) اور اعداد کے علم (Numeracy) کو خواندگی کا حصہ تصور کیا جاتا ہے ۔

پاکستان میں خواندگی کی شرح

1951 ء سے لے کر 1981 ء تک خواندگی کو مردم شماری کے مطابق دیکھا جائے تو ہم نے اس سلسلہ میں بہت کم ترقی کی ہے ۔ مردم شماری کے اعدادو شمار کے مطابق خواندگی کی شرح 1951 ء میں 16.4 فیصد ، 1961 ء میں 13.6 فیصد ، 1972 ء میں 21.7 فیصد اور 1981 ء میں 26.2 فیصد تھی ۔

ان اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ ہم تیس سال کے عرصہ میں شرح خواندگی قریباً دس فیصد بڑھا سکے ہیں ۔ حکومت پاکستان کی جانب سے 1986 ء میں شائع شدہ اعداد و شمار کے مطابق شرح خواندگی کا تجزیہ حسب ذیل ہے ۔

الف) شرح خواندگی شہری علاقوں میں 47.1 فیصد ہے اور دیہی علاقوں میں 17.3 ۔ اس طرح دیہی علاقوں میں شہری علاقوں کے مقابلے میں شرح خواندگی بہت کم ہے ۔

ب) خواتین کی شرح خواندگی ، مردوں کے مقابلے میں کم ہے اور خاص طور پر دیہی علاقوں میں خواتین کی شرح خواندگی بہت ہی کم ہے یعنی مردوں کی شرح خواندگی 35.1 فیصد کے مقابلہ میں عورتوں کی شرح خواندگی 16.1 فیصد ہے ۔

ج) اس وقت ، شرح خواندگی کے اعتبار سے صوبہ سندھ سب سے آگے ہے تاہم اس صوبہ کے دیہی علاقوں میں خواندگی کی شرح اب بھی پنجاب سے کم ہے جب کہ شہری علاقوں میں یہ شرح پنجاب سے زیادہ ہے (سندھ 31.5 فیصد ، پنجاب 27.4 فیصد)

د) بلوچستان میں شرح خواندگی تمام صوبوں سے کم یعنی 10.3 فیصد ہے ۔

پاکستان کی شرح خواندگی کا مقابلہ دیگر ممالک کے ساتھ

جنوبی ایشیا میں گو اقتصادی ترقی کے اعتبار سے ہم ترقی پذیر ممالک کے زمرہ میں شامل ہیں تاہم خواندگی کے لحاظ سے ہم بہت پسماندہ ہیں ۔ اس کا اندازہ 1977 ء کے درج ذیل اعداد و شمار سے کیا جا سکتا ہے ۔

ملک	ناخواندگی کی شرح
فلپائن	17.4 فیصد
تھائی لینڈ	21.4 فیصد
سری لنکا	22.4 فیصد
انڈونیشیا	43.4 فیصد
ملائشیا	44.8 فیصد
ترکی	48.7 فیصد

ایران	63.1 فیصد
بھارت	66.6 فیصد
پاکستان	84.6 فیصد

مقام افسوس ہے کہ ہم خواندگی کے اعتبار سے سب سے پیچھے ہیں ۔

ناخواندگی کی وجوہات

درج بالا اعداد و شمار سے صاف ظاہر ہے کہ پاکستان میں ناخواندگی کی شرح بہت ہی زیادہ ہے اس کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں ۔ لیکن یہاں اہم وجوہات کا ذکر کیا جائے گا ۔

الف) آبادی میں اضافہ

پاکستان میں آبادی میں تین فیصد سالانہ کے حساب سے اضافہ ہو رہا ہے ۔ جب کہ تعلیمی سہولتیں اس کے مطابق مہیا نہیں کی جا سکی ہیں ۔

ب) پرائمری سکولوں میں داخلہ

اس وقت پانچ سے 10 سال کی عمر کے بچوں کی کل تعداد کا 45 فیصد حصہ مدرسوں میں داخلہ لیتا ہے ۔ خاص طور پر گاؤں میں موجود تعلیمی سہولتوں سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے ۔

ج) پرائمری سطح پر تعلیم ترک کرنے کا رجحان

بچوں کی ایک خاصی بڑی تعداد پرائمری تک تعلیم مکمل کیے بغیر سکول چھوڑ دیتی ہے ۔

د) پرائمری سکولوں میں کمی

1947 ء کے بعد پرائمری سکولوں کی تعداد میں دس گنا اضافہ ہوا ہے ، لیکن یہ تعداد سکول میں داخلے کے قابل بچوں کی تعداد کے مقابلے میں اب بھی بہت کم ہے ۔

ہ) تعلیم کے بارے میں والدین کا رویہ

غیر تعلیم یافتہ والدین اپنے بچوں کو سکول بھیجنے کی اہمیت سے غافل ہیں ۔ انھیں اپنے

بچوں کو سکول بھیجنے کا کوئی فوری مالی فائدہ نظر نہیں آتا ۔

ز) تعلیم بالغاں کی سہولتوں کا فقدان

ہمارے ملک کی کثیر بالغ آبادی ناخواندہ ہے ۔ حکومت کی تمام کوششوں کے باوجود ، تعلیم بالغاں کا قابل عمل انتظام ممکن نہیں ہو سکا ۔

خواندگی میں اضافہ کی مختلف تجاویز اور کاروائیاں

حکومت پاکستان نے خواندگی میں اضافہ کے لیے بہت سی سکیمیں تیار کیں ۔ اس سلسلے میں کئی ایسی تجاویز سامنے آئیں جن پر بھر پور عمل کیا جاتا تو اب تک دنیا کی ترقی پذیر قوموں میں ہمارا نمبر خاصا اوپر ہوتا ۔ مالی وسائل کی کمی ہماری بڑی کمزوری رہی ہے ۔ اب تک خواندگی کے سلسلے میں جو کوششیں کی گئیں انھیں مختصراً ذیل میں بیان کیا جاتا ہے ۔

الف) پرائمری تعلیم کو عام کرنا

خواندگی کے عمل میں پرائمری تعلیم کو بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ پرائمری تعلیم کو عام کرنے کے لیے حکومت نے ہر گاؤں میں پرائمری سکول اور مساجد میں مکتب سکول کھولنے کا انتظام کیا ہے ۔ ملک میں اس وقت 76 ہزار پرائمری اور ساڑھے چھ ہزار مڈل سکول کام کر رہے ہیں ۔ مکتب سکول ان کے علاوہ ہیں ۔

ب) تعلیم کے غیر رسمی ذرائع استعمال کرنا

پرائمری تعلیم کے رسمی ادارے ، صرف ان بچوں کو تعلیم مہیا کرتے ہیں جن کی عمر 5 سے 10 سال کے درمیان ہو اور وہ ان اداروں میں باقاعدہ داخلہ لے کر تعلیم حاصل کریں ۔ جب کہ ہمارے ملک میں دس سال سے زیادہ عمر کے ان پڑھ افراد کی تعداد ایک اندازہ کے مطابق چار کروڑ ہے ۔ ان افراد کو تعلیم دینے کے لیے حکومت نے تعلیم بالغاں کے 5000 مراکز کھولے ہیں اور مکمل کمیشن قائم کیا ہے ۔

ان کوششوں کے علاوہ چند اور تجاویز بھی حکومت کے زیر غور ہیں ۔ مثلاً ڈرائیونگ

لائسنس صرف ان افراد کو دیے جائیں جو خواندہ ہوں ۔ قیدیوں کو خواندگی حاصل کرنے کی صورت میں قید کی مدت میں چھوٹ دی جائے ۔ خواندہ افراد کو نچلے درجے کی ملازمتوں میں ترجیح دی جائے وغیرہ ۔ اس قسم کے محرکات کی بناء پر امکان ہے کہ ناخواندہ افراد پڑھنے لکھنے کی طرف راغب ہوں گے ۔ خواندگی کی شرح میں اضافہ بہر حال صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ قوم کے تمام افراد تعلیم اور خواندگی کی اہمیت کو سمجھیں اور مجموعی طور پر اس مہم میں حصہ لیں ۔ تعلیم یافتہ افراد کی ذمہ داری ہے کہ وہ ناخواندگی کے خاتمہ کے لیے حکومت کی کوششوں میں لگن ، تن دہی اور دل جمعی سے شریک ہوں ۔

تعلیمِ نسواں

خواتین کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں اسلام نے بڑا زور دیا ہے اور اس کا حصول مسلمان مرد و عورت دونوں پر یکساں فرض قرار دیا ہے ۔ تعلیمی اہمیت کے لحاظ سے باپ کے مقابلہ میں ماں کا درجہ فائق بنایا ہے ۔ اس کی وجہ یہی نظر آتی ہے کہ ماں اپنی اولاد سے محبت کے جذبات رکھنے کے علاوہ ابتدائی طور پر اس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ دار بھی ہوتی ہے ۔ اگر ہم ملک کے استحکام اور تحفظ کو یقینی بنانے کے خواہش مند ہیں تو ہم پر لازم ہے کہ خواتین کی تعلیم کا مناسب انتظام کریں ۔

ماں کی گود ہر بچے کی تعلیم کا پہلا گہوارہ ہے ۔ بچہ اپنی ماں کی گود ہی میں ابتدائی طور پر دنیاومافیہا سے واقف ہوتا ہے ۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کون کیا ہے ۔ کس کام میں اس کی بہتری ہے رشتے ناطے کیا ہیں ؟ مظاہر فطرت کیا ہیں ؟ نیکی اور بدی کیا ہے ؟ ماں کی گود ہی میں اس کی عادتیں بنتی ہیں ۔ اس کے رویے پروان چڑھتے ہیں ۔ وہ عقائد اور افکار سے روشناس ہوتا ہے ۔ ماں کے کردار کے علاوہ بھی ایک خاتون کو معاشرے میں مختلف کردار ادا کرنے ہیں ۔ زندگی کے کئی شعبے ایسے ہیں جن میں خواتین کی ضرورت پیش آتی ہے ۔ مثلاً خواتین کے مسائل کو ایک تعلیم یافتہ خاتون بہتر طور پر سمجھ سکتی ہے اور انھیں مناسب انداز میں پیش کرنے اور حل کرنے کے قابل ہوتی ہے ۔ وہ ایک اچھی ڈاکٹر ، چھوٹے بچوں کو پیار کرنے والی معلمہ ، نرس اور امور خانہ داری کی تربیت کی ماہر ہو سکتی ہے ۔

موجودہ صورت حال

خواتین کی تعلیم کی اس ہمیت کے باوجود ، اس وقت صورت حال خوش کن نہیں ہے ۔ خواندگی کے اعتبار سے پاکستان میں صرف **16.8** فیصد خواتین خواندہ ہیں ۔ شہری علاقوں میں یہ شرح **37.3** فیصد اور دیہی علاقوں میں **7.3** فیصد ہے ۔ پنجاب میں خواتین کی کل شرح خواندگی **16.8** فیصد ہے ، شہری علاقوں میں **36.7** فیصد اور دیہی علاقوں میں **9.4** فیصد ہے ۔ ان خواندہ خواتین میں پرائمری تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین سب شامل ہیں ۔

پاکستان میں پرائمری پاس تعلیم یافتہ افراد سے لے کر اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی کل تعداد کا صرف **25** فیصد تعلیم یافتہ خواتین ہیں ۔ ان میں اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کی تعداد بہت کم ہے ۔

جہاں تک خواتین کے لیے تعلیمی سہولتوں کا تعلق ہے وہ مردوں کے مقابلہ میں ہمیشہ کم رہی ہیں ، مثلاً خواتین کے لیے قائم کیے جانے والے تعلیمی اداروں کی تعداد مردوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے ۔ خواتین کی تعلیمی سہولتوں میں پرائمری ، مڈل ، ہائی سکول اور کالج کی سطح پر خاصا اضافہ ہوا ۔ گو یہ اضافہ آبادی میں خواتین کی تعداد سے مطابقت نہیں رکھتا تاہم یہ اضافہ بڑا خوش آئند ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری حکومت خواتین کی تعلیم پر ترجیحی توجہ دے رہی ہے ۔

تعلیم کے بارے میں عوام کے رویے میں بھی خوش کن تبدیلی رونما ہوئی ہے ۔ آزادی کے وقت بچیوں کو قرآن مجید اور اسلامی عقائد و ارکان کی تعلیم کے علاوہ سکولوں میں تعلیم دلوانا معیوب سمجھا جاتا تھا ۔ گو کہ پاکستان کے کچھ غیر ترقی یافتہ علاقوں میں اب بھی یہ رجحان موجود ہے لیکن جہاں جہاں تعلیم کی روشنی پھیلی ہے اور ابلاغ کے ذرائع پہنچے ہیں ، اس رویے میں انقلابی تبدیلی آئی ہے ۔ لوگوں نے اپنے علاقوں میں سکول اور کالج قائم کرنے کے مطالبات کیے ہیں اور اس طرح پرائمری سکول سے لے کر کالج تک کی تعلیم عام

ہو رہی ہے ۔ خواتین کی تعلیم کے عام ہونے کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ 1947ء کے مقابلہ میں پرائمری سکولوں میں داخلہ ایک لاکھ سے بڑھ کر سولہ لاکھ ہوگیا ہے ۔ مڈل سکولوں میں 21000 سے بڑھ کر 294000 ہوگیا ہے جب کہ کالجوں میں یہ تعداد 11000 کے مقابلہ میں 53000 ہو گئی ہے۔ پیشہ ورانہ کالجوں میں آزادی کے وقت یہ تعداد 327 تھی۔ اور 1985ء میں 8725 خواتین ایسے کالجوں میں زیر تعلیم تھیں یہی بات یونیورسٹیوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ ان اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ نہ صرف تعلیمی سہولتوں میں اضافہ ہوا ہے بلکہ تعلیم نسواں کے بارے میں افراد معاشرہ کے رویوں میں بھی خوشگوار تبدیلی آئی ہے۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ اب خواتین تعلیم کے ان شعبوں میں بھی داخلہ لے رہی ہیں جن کے بارے میں یہ تصور کیا جاتا تھا کہ وہ مردوں کے لیے مخصوص ہیں یعنی انجنیئرنگ، کامرس، زراعت، قانون وغیرہ۔

تعلیمِ نسواں میں کمی کی وجوہات

ہمارے ملک کی بہت کم خواتین یعنی صرف 16 فیصد زیور تعلیم سے آراستہ ہیں ۔ اس صورت حال کی درج ذیل وجوہات ممکن ہو سکتی ہیں ۔

الف) تعلیم کے بارے میں والدین کا رویہ

ہمارے ملک کی کثیر آبادی تعلیم کو نفع بخش نہیں سمجھتی ہے لوگ بچیوں کی تعلیم کو وقت کا ضیاع سمجھتے ہیں ۔

ب) بچیوں کے لیے تعلیمی سہولتوں کی کمی

بچیوں کے لیے تعلیمی اداروں کی کمی ہے ۔ شہروں میں حکومت کے قائم کیے ہوئے تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ نجی تعلیمی ادارے بھی کھولے جارہے ہیں اور یہ ادارے تعلیمی

— طلبہ مستقبل کے خوف اور بے یقینی کا شکار ہو کر تعلیم کی اہمیت سے واقف ہو جاتے ہیں۔ ص غ

— مساوات سے مراد ہے کہ تمام افراد اپنی صلاحیتوں، استعداد، لیاقت اور توانائی کے لحاظ سے برابر ہیں۔ ص غ

— متفرق امور سے مشروط کیے بغیر مساوات کا تصور ممکن نہیں۔ ص غ

— تعلیم کا مقصد صرف افراد کو روزی کمانے کے قابل بنانا ہے ص غ

— لوگوں کے روزگار اختیار کرنے کا دارومدار ملک کی معاشی و اقتصادی ترقی پر ہے۔ ص غ

— روزگار کی ہر سطح پر افراد کو ایسی مہارتوں کی ضرورت ہوتی ہے جو مستقبل میں معاشی ترقی میں کام آسکیں ۔ ص غ

— ہمارے ملک میں تعلیم کی اس انداز سے منصوبہ بندی کی گئی ہے کہ تمام افراد جو تعلیمی اداروں سے نکلیں وہ باقاعدہ روزگار اپنا سکیں۔ ص غ

— تعلیم مکمل کرنے پر ہر فرد سکول چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ ایسے فرد کو "تارک مدرسہ" کہتے ہیں۔ ص غ

— جو بچے سکول سے سرٹیفیکیٹ لے کر چلے جاتے ہیں۔ انہیں ترک مدرسہ کی شرح میں شامل نہیں کیا جاتا۔ ص غ

— پہلی جماعت میں داخل ہونے والے طلبہ کی تعداد میں سے قریباً 50 فیصد طلبہ پانچویں جماعت تک تعلیم مکمل کرتے ہیں۔ ص غ

19 - درج ذیل سوالات کے صحیح جواب منتخب کرکے اس کے ساتھ دی ہوئی لکیر پر نشان لگائیے۔

الف) **1981**ء کی مردم شماری کے مطابق خواندگی کی یہ تعریف کی گئی ہے۔

(i) کسی زبان میں چھپے ہوئے الفاظ پڑھنے اور ان کا مفہوم سمجھنے کی صلاحیت.........

(ii) کسی زبان کے اخبار میں چھپی ہوئی عبارت اور سادہ خط لکھنے کی صلاحیت.........

(iii) کسی زبان میں چھپی ہوئی عبارت پڑھنے اور اس کا مفہوم سمجھنے اور لکھنے کی صلاحیت.........

17 - بچوں کے سکول سے بھاگنے کی عادت میں کون سے عوامل مددگار ہوتے ہیں؟ بچوں کی کثیر تعداد کو مدرسہ میں برقرار رکھنے کی تجاویز بھی پیش کیجیے؟

18 - صحیح بیان کی صورت میں "ص" اور غلط بیان کی صورت میں "غ" کے گرد دائرہ لگائیے۔

- خواندگی کے معیار کا تعلق کسی ملک میں پڑھے لکھے افراد کی تعداد پر منحصر ہے۔ ص غ
- پاکستان میں ناخواندہ افراد کی تعداد 73.8 فیصد ہے۔ ص غ
- خواتین کی شرح خواندگی مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہے ۔ ص غ
- پاکستان کی آبادی میں 1981ء کی مردم شماری کے مطابق خواتین کی آبادی کا تناسب 47.5 فیصد ہے۔ ص غ
- خواتین کی تعلیم پر اسلام نے زور نہیں دیا ہے۔ ص غ
- پاکستان میں 16.8 فیصد خواتین خواندہ ہیں۔ ص غ
- ہر شعبہ زندگی میں کام کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی پیشہ ورانہ اخلاقیات کو اپنائیں۔ ص غ
- پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کو اختیار کرنے اور اجتماعی طور پر ان کو اپنانے کے لیے تمام افراد کا ایک "اجتماعی ضمیر" ہوتا ہے۔ ص غ
- ہمارے ملک میں مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے اپنا "ضابطہ اخلاق" تشکیل دیا ہے اور وہ اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ ص غ
- پیشہ ورانہ اخلاقیات کی بنیادوں میں سے ایک اہم اساس "عامۃ الناس سے ربط و تعلق" ہے۔ ص غ
- طلبہ، کردار میں ناپختگی اور خواہشات پر قابو پانے کی صلاحیت کی کمی کی بناء پر جارحیت سے گریز کرتے ہیں۔ ص غ
- ہنگامہ پرور طلبہ کی مختصر تعداد، باقی طلبہ کو بھی حیلوں بہانوں سے اکسا کر نظم و ضبط غارت کرنے کا باعث بنتی ہے۔ ص غ

مشقی سوالات

1 - خواندگی سے کیا مراد ہے ۔ پاکستان اور دیگر ایشیائی ممالک میں خواندگی کا موازنہ کیجیے ۔

2 - پرائمری سطح کی تعلیم کِس طرح خواندگی میں اضافہ کا باعث بن سکتی ہے ۔

3 - آپ کے خیال میں خواتین کی تعلیم میں کمی کی کیا وجوہات ہیں ۔ سب سے اہم وجہ کی نشان دہی کریں ۔

4 - پیشہ ورانہ اخلاقیات کی وضاحت کیجیے اور اُس کے عناصر تحریر کیجیے ۔

5 - ضابطہ اخلاق کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے ۔ وضاحت کیجیے ۔

6 - اساتذہ اپنے خصوصی پیشہ ورانہ وظائف کی بنا پر کن امور کے ذمہ دار ہوتے ہیں ۔ تفصیل سے بیان کیجیے ۔

7 - نظم و ضبط سے کیا مراد ہے۔ اُس کے فقدان کی وجوہات بیان کیجیے۔

8 - طلبہ میں نظم و ضبط کے فقدان کو ختم کرنے کے لیے تجاویز پیش کریں۔

9 - معیارِ تعلیم کی جامع تعریف کیجیے۔ اور معیارِ تعلیم پر اثر انداز ہونے والے پانچ عوامل بیان کیجیے۔

10 - کیا واقعی معیارِ تعلیم روبہ تنزل ہے۔ اتفاق یا اختلاف کی صورت میں دلائل دیجیے۔

11 - تعلیم کے یکساں مواقع فراہم کرنے کے سلسلے میں کون سے اقدام ضروری ہیں ۔

12 - روزگار سے کیا مراد ہے ؟ روزگار کے چار بنیادی طریقوں کی نشان دہی کیجیے۔

13 - روزگار کی مختلف اقسام کن اساسی پیشوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

14 - روزگار کے لحاظ سے تعلیمی منصوبہ میں کن امور کا خیال رکھنا چاہیے۔

16 - ترکِ مدرسہ سے کیا مراد ہے؟ عوام کا تعلیم کے بارے میں رویہ کس طرح ترک مدرسہ پر اثر انداز ہوتا ہے؟

1) جن مقامات پر سکول موجود ہیں اور تمام بچوں کے لیے کافی ہیں وہاں لازمی تعلیم کا قانون رائج کیا جائے ۔

2) غریب والدین کے بچوں کی تعلیم مفت کر دی جائے اور ایسے بچوں کو کتابیں اور دیگر ضروری سامان مفت فراہم کیا جائے ۔

3) تعلیم کے فوائد کی تشہیر ابلاغ عامہ کے ذریعے بھرپور انداز میں کی جائے ۔

4) نصاب تعلیم میں ایسے عملی کام شامل کیے جائیں جن کے ذریعے بچے ایسے کام سیکھ سکیں جو انھیں روزی کمانے کی صلاحیت سے مزین کریں ۔

5) پرائمری مدارس میں بڑی عمر والے اور تجربہ کار اساتذہ متعین کیے جائیں ۔

6) پرائمری اساتذہ کی تربیت میں اس انداز سے اصلاح کی جائے کہ وہ بچوں کی نفسیات اور ان کی تدریس کے طریقوں کی خاص عملی تربیت حاصل کریں ۔

7) پرائمری سکولوں کو دلکش اور پرکشش بنایا جائے تاکہ بچے سکول آنے اور وہاں رہ کر تعلیم حاصل کرنے میں خوشی محسوس کریں ۔

8) جہاں جہاں ممکن ہو پرائمری سکولوں میں صرف خواتین معلمات تعینات کی جائیں اور بچوں اور بچیوں کو اکٹھی تعلیم دی جائے ۔ اس طرح بچوں کو پیار اور محبت کی فضا میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع نصیب ہو گا ۔

9) داخلہ کی عمر 5 سال سے بڑھا کر 6 یا 7 سال کر دی جائے تاکہ بچے کچھ سمجھدار ہو کر سکول میں داخل ہوں ۔

10) جہاں ممکن ہو سکے غیر درجہ واری طریقۂ تعلیم رائج کیا جائے ۔ فیل ہونے کا امکان کم سے کم کیا جائے تاکہ بچے ایک درجہ سے دوسرے درجہ میں مسلسل ترقی پا سکیں ۔ موجودہ امتحانی نظام کا طریقہ کار ختم کر دیا جائے تاکہ بار بار ناکامی کی وجہ سے سکول چھوڑ جانے والے بچوں کو سکول میں رکھا جا سکے ۔

* * * * *

کے لیے تیار کرنا بھی ہے ۔ پرائمری سکولوں میں جو نصاب رائج ہے وہ پیشہ ورانہ تیاری سے متعلق نہیں ہے ۔ والدین تعلیم سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ بچوں میں ایسی صلاحیت پیدا کرے کہ وہ بالآخر کوئی پیشہ اختیار کر سکیں ۔ ہمارے مدارس میں ایسا کوئی انتظام نہیں ہے ۔

7) بار بار کی ناکامی

بعض بچے ایک جماعت میں بار بار کی ناکامی کی وجہ سے بھی سکول چھوڑ جاتے ہیں کیونکہ وہ اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ اپنی ذہنی سطح یا اساتذہ کے سخت گیر رویے کی وجہ سے تعلیم پر پوری توجہ نہیں دے سکتے اس لیے سکول سے بھاگنا شروع کرتے ہیں اور آخر کار سکول چھوڑ کر چلے جاتے ہیں ۔

8) ہم جولی گروہ

بچوں پر ان کے ہم جولیوں کا بڑا اثر ہوتا ہے ۔ اگر بچے ایسے گروہ میں شامل ہو جائیں جس میں شامل بچے بری عادتوں کا شکار ہوں تو وہ بچے بھی ان عادتوں کو اپنا لیتے ہیں اور ان بری عادتوں میں ملوث ہونے کی بناء پر اساتذہ کے منفی رویہ کی وجہ سے وہ بغاوت پر اتر آتے ہیں ۔ وہ بھگوڑا پن اختیار کر لیتے ہیں اور آخر کار سکول چھوڑ کر چلے جاتے ہیں ۔

یہ ترک مدرسہ کی عمومی وجوہات ہو سکتی ہیں ۔ کچھ وجوہات ذاتی نوعیت کی بھی ہو سکتی ہیں مثلاً بیماری ، غربت ، ماں باپ میں ناچاقی والدین کی بے توجہی اور سفر کی سہولت کی عدم موجودگی وغیرہ ۔

ترکِ مدرسہ کا تدارک

یہ امر ہمارے لیے باعث افسوس ہے کہ ہم اپنے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ نہیں کر سکتے اور جو بچے سکولوں میں پہلی جماعت میں داخل ہوتے ہیں انھیں کم از کم پرائمری سطح کی تعلیم مکمل کرنے پر آمادہ یا مجبور نہیں کر سکتے ۔ اس سلسلہ میں درج ذیل تجاویز پر عمل کرنے سے صورت حال بہتر ہو سکتی ہے ۔

2) عوام کا تعلیم کے بارے میں رویہ

سکول چھوڑنے کی دوسری وجہ تعلیم کے بارے میں عوام کا عمومی رویہ اور والدین کا خصوصی رویہ ہے ۔ لوگ تعلیم کو کوئی منفعت بخش کام نہیں سمجھتے ۔ وہ اسے وقت کا ضیاع تصور کرتے ہیں ۔ اس لیے وہ ابتدائی عمر ہی سے بچوں کو ایسے کاموں میں لگا دیتے ہیں جن کو سیکھ کر وہ کوئی پیشہ اختیار کر سکیں ۔

3) گھریلو کاموں میں شرکت

بچیوں کے سلسلے میں خصوصاً والدین کا رویہ کچھ ایسا ہے کہ بچیاں جلد ہی سکول چھوڑ جاتی ہیں ۔ گھر میں ماں کو بہت کام انجام دینے ہوتے ہیں لہٰذا مائیں چاہتی ہیں کہ ان کی بچیاں گھریلو کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹائیں اور شروع ہی سے خانہ داری سیکھ جائیں ۔

4) سکول کے حالات اور سہولتیں

ہمارے ملک کے اکثر پرائمری سکولوں کی حالت غیر تسلی بخش اور غیر دلکش ہے ۔ ان میں ضروری سہولتوں کا فقدان ہے ۔ وہ سکول کے غیر دلکش ماحول سے جلد اکتا جاتے ہیں ۔ بھگوڑا پن اس کا ایک نتیجہ ہے ۔ بالآخر بچے سکول کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ جاتے ہیں ۔

5) اساتذہ کا رویہ اور تربیت

بعض بچوں کو اساتذہ کا سخت گیر رویہ بھی سکول چھوڑ جانے پر مجبور کر دیتا ہے ۔ بچوں کو مار پیٹ ، بغاوت پر آمادہ کرتی ہے اور وہ سکول سے بھاگنا شروع کر دیتے ہیں اور آخر کار ہمیشہ کے لیے سکول چھوڑ جاتے ہیں ۔ ہمارے پرائمری سکولوں میں اساتذہ ناتجربہ کار ، کم عمر اور بچوں کی عملی نفسیات سے ناواقف ہوتے ہیں لہٰذا بچے اساتذہ کے سخت گیر رویہ اور ناموزوں تدریسی طریقوں سے متنفر ہو کر سکول سے بھاگ جاتے ہیں ۔

6) غیر موزوں نصاب

عوام الناس کے خیال میں تعلیم کا کام ، معاشرتی نشوونما کے ساتھ بچوں کو کسی پیشہ

ایکشن پلان میں بیان کردہ شماریات کے مطابق اس وقت پاکستان میں یہ شرح 50 فیصد ہے یعنی پہلی جماعت میں داخل ہونے والے طلبہ کی تعداد میں سے 50 فیصد طلبہ پانچویں جماعت تک تعلیم مکمل کرنے سے پہلے ہی سکول چھوڑ کر چلے جاتے ہیں ۔ 1972ء میں کی گئی ایک تحقیق کے مطابق 36.7 فیصد (اور اوسطاً 7.34 فیصد ہر جماعت سے) سکول چھوڑ کر چلے جاتے ہیں ۔ 1985ء میں اکادمی آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ مینجمینٹ کی ایک تحقیق کے مطابق یہ شرح 41 فیصد سے 43 فیصد تک ہے ۔ اس تحقیق کے مطابق سب سے زیادہ طلبہ پہلی جماعت ہی میں سکول چھوڑ جاتے ہیں ۔ پہلی جماعت کے بچوں میں یہ شرح 12.7 فیصد ، بچیوں میں 13.9 فیصد ، شہری اعتبار سے 14.1 فیصد اور دیہی علاقوں میں 10.4 فیصد ہے ۔ دیہی علاقوں میں بچیوں کے سکول چھوڑ جانے کی شرح مقابلتاً زیادہ ہے ۔

ترکِ مدرسہ کی وجوہات

بچے سکول کیوں چھوڑ جاتے ہیں یا ان کے والدین بچوں کو مدرسہ سے کیوں اٹھا لیتے ہیں ؟ یہ سوال ہمارے لیے لمحہ فکریہ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ذیل میں ترک مدرسہ کی چند وجوہات بیان کی جاتی ہیں ۔

1) غربت

ہمارے ملک میں اکثریت ان طبقات سے تعلق رکھتی ہے جو مفلسی میں زندگی گزراتے ہیں ۔ وہ اپنے بچوں کی تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہیں ہیں ۔ ابتداء میں تو وہ بچوں کو سکول میں داخل کرا دیتے ہیں لیکن بعد میں سکول کے اخراجات کی وجہ سے سکول سے اٹھا لیتے ہیں ۔ چونکہ بچوں کے لیے محنت مزدوری کے مواقع موجود ہوتے ہیں لہٰذا بچے ورکشاپوں ، ہوٹلوں ، چائے خانوں اور امراء کے گھروں میں کام کر کے ماں باپ کی آمدنی میں اضافہ کرتے ہیں ۔ یوں والدین تعلیم کی نسبت اپنے بچوں کے ذریعے آمدنی میں اضافہ کو ترجیح دیتے ہیں ۔

حال کو ترک مدرسہ کہا جائے گا اور تعلیمی سلسلہ منقطع کرنے والے طالب علم کو تارک مدرسہ ۔ اس لحاظ سے تارک مدرسہ سے مراد "ایسا طالب علم ہے جو نفسیاتی ، معاشی ، معاشرتی یا ذہنی پسماندگی کی وجہ سے کسی درجے میں تعلیم ادھوری چھوڑ کر سکول کو خیر باد کہہ دیتا ہے ۔"

پاکستان میں تارک مدرسہ کی اصطلاح کا اطلاق عموماً پرائمری سکول چھوڑ جانے والے بچوں پر کیا جاتا ہے جب کہ دوسرے ممالک میں یہ اصطلاح ان بچوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو لازمی تعلیم کی مدت سے قبل مدرسہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں ۔ امریکہ میں یہ اصطلاح ثانوی تعلیم کے بارہویں درجہ تک تعلیم مکمل کیے بغیر سکول چھوڑ جانے والے بچوں کے لیے استعمال ہوتی ہے ۔ تاہم اس اصطلاح کا اطلاق ان بچوں پر بھی ہوتا ہے جو کسی ایک جماعت یا سطح کی تعلیم مکمل کیے بغیر سکول چھوڑ جاتے ہیں ۔

ترکِ مدرسہ کی شرح

فرض کیجیے کہ ایک سکول میں 100 بچوں نے پہلی جماعت میں داخلہ لیا اور پانچویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے یہ تعداد صرف 40 رہ گئی ۔
اس کے علاوہ مختلف جماعتوں میں فیل ہونے والے بچوں کی تعداد 15 تھی اور دس بچے سرٹیفیکیٹ لے کر چلے گئے ۔ اس طرح تعلیم جاری رکھنے والے طلبہ کی تعداد 40 + 15 + 10 = 65 طلبہ رہی ۔ اور 100 میں سے 35 طلبہ نے نفسیاتی ، معاشی ، معاشرتی اور ذہنی پسماندگی کی بناء پر تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا ۔ لہٰذا پہلی جماعت میں داخل ہونے والے 100 بچوں میں سے 35 فیصد بچے تارک مدرسہ کہلائیں گے ۔

پاکستان میں شرح ترکِ مدرسہ

کسی ایک جماعت یا سطح تعلیم مکمل کیے بغیر سکول چھوڑ جانے کے لحاظ سے پاکستان ان ممالک میں شامل ہے جہاں ترک مدرسہ کی شرح بہت زیادہ ہے ۔ قومی تعلیمی پالیسی اور

اس وقت ملک میں 65 کمرشل انسٹی ٹیوٹ ، 12 ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ ، 87 ووکیشنل اور انڈسٹریل ادارے ، 15 انجنیئرنگ کالج ، 19 میڈیکل کالج ، 18 کامرس کالج ، 4 زرعی کالج ، 15 لاء کالج اور 17 ایجوکیشن کالج اور بہت سے دیگر پیشہ ورانہ ادارے کام کر رہے ہیں ۔ ان اداروں کے علاوہ ملک کی موجودہ بیس یونیورسٹیوں میں پیشہ ورانہ تعلیم کے شعبے مثلاً قانون ، بزنس ایڈمنسٹریشن ، کیمیکل انجنیئرنگ ، کامرس ، ایجوکیشن وغیرہ قائم ہیں ۔ ان اداروں کے علاوہ نجی طور پر بھی کئی ادارے پیشہ ورانہ تعلیم فراہم کر رہے ہیں ۔ جن میں کمپیوٹر پروگرامنگ ، ووکیشنل اور ٹیکنیکل ، ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ ، ائیرکنڈیشننگ اور اسی قسم کی دوسری مہارتوں کا انتظام کیا گیا ہے ۔

موجودہ انتظامات ہماری ضروریات کے مقابلے میں ناکافی ہیں اور ضرورت اس امر کی ہے کہ ووکیشنل اور پیشہ ورانہ تربیت کے مزید ادارے کھولے جائیں ۔ تاہم ان شعبوں میں تربیت فراہم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہر شعبے میں ہم اپنی ترجیحات مقرر کرکے تعلیمی منصوبہ بندی کریں ۔

ترکِ مدرسہ

پاکستان کا شمار ان ممالک میں کیا جاتا ہے جہاں خواندگی کی شرح بہت کم ہے ناخواندگی کی وجوہات میں سے ایک وجہ ترک مدرسہ ہے

ترکِ مدرسہ کی تعریف

تعلیم مکمل کرنے پر ہر فرد سکول چھوڑ دیتا ہے ۔ اس انداز سے سکول چھوڑنے کو ترک مدرسہ نہیں کہا جاتا ۔ بعض بچے کچھ اور وجوہات کی بناء پر سکول سے باقاعدہ سرٹیفکیٹ لے کر چھوڑتے ہیں تاکہ کسی دوسرے سکول میں داخلہ حاصل کر سکیں ۔ ایسے بچے بھی تارک مدرسہ (Drop out) نہیں کہلائیں گے ۔ بچوں کی کچھ تعداد باقاعدہ سکول میں داخل ہوتی ہے ۔ پھر ایک مقررہ مدت تک تعلیم مکمل کئے بغیر سکول چھوڑ کر چلی جاتی ہے وہ نہ تو سرٹیفکیٹ حاصل کرتے ہے اور نہ ہی کسی دوسرے سکول میں داخلہ حاصل کرتے ہیں ۔ اس قسم کے بچے ، بعض اوقات پہلی جماعت سے ، بعض دوسری ، تیسری یا چوتھی جماعت سے سکول چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور معینہ مدت اور مقررہ نصاب کے مطابق تعلیم حاصل نہیں کرتے ایسی صورت

ب) افراد میں مختلف پیشوں کے مطابق کن صلاحیتوں کی ضرورت ہے ؟

ج) ہر شعبہ روزگار میں کتنے افراد کی ضرورت ہوگی اور کیا ہمارا موجودہ نظام تعلیم اوراداروں کی تعداد اس ضرورت کو پورا کرنے کی گنجائش رکھتے ہیں ؟

د) مستقبل میں کس قسم کی ٹکنالوجی کی توسیع و ترقی اور اس ٹکنالوجی کی بناء پر کن نئے پیشوں کے وجود میں آنے کے امکانات ہیں ۔

ہ) کیا افراد کو اس انداز میں تیار کرنے کے انتظامات کیے جا رہے ہیں کہ وہ ملازمتوں کی طرف دیکھنے کی بجائے ذاتی حیثیت میں نجی روزگار اختیار کرنے پر آمادہ ہوں اور

و) کیا روزگار کے مختلف مواقع اور شعبوں میں افراد کو رہنمائی اور مشاورت فراہم کرنے کا بندوبست کیا گیا ہے ۔

پیشہ ورانہ تعلیم میں پیش رفت

پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے اور ہمیں آزادی کے وقت جو تعلیمی بنیاد ورثہ میں ملی وہ ہماری تمام تر ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ناکافی تھی ۔ تعلیم کا صرف ایک مقصد تھا اور وہ تھا وفادار ماتحت ، ملازم اور بیوروکریٹ تیار کرنا تاکہ حکومت برطانیہ کا تسلط برقرار رہ سکے ۔ آزادی کے وقت پیشہ ورانہ تعلیم کے معدودے چند ادارے ہمیں ملے ۔ وہ ادارے بھی اس لیے قائم کیے گئے تھے کہ غیر منقسم ہندوستان میں انگریز حکمرانوں کو ایسے افراد میسر آسکیں جو چند بنیادی خدمات فراہم کرنے کے کام آسکیں اور ایسے کاموں کے لیے برطانیہ سے لوگ نہ منگانا پڑیں ۔ آزادی کے بعد ہماری ضروتیں بڑھ گئیں ۔ ہمارے لیے ضروری ہوگیا کہ ملک کی اقتصادی ترقی کے لیے نیم تربیت یافتہ اور تربیت یافتہ کارکن اور ماہرین میسر آسکیں ۔ اس طرح پیشے تعداد میں بڑھ گئے ۔ دنیا بھر میں سائنس اور ٹکنالوجی نے بھی مزید ترقی کی اور معاشی میدان میں پیشوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ۔ ان ضرورتوں کا خیال رکھتے ہوئے حکومت نے اس شعبہ تعلیم پر توجہ دی تاکہ معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ لوگوں کو روزگار میسر آسکیں ۔ اس وقت ملک میں پیشہ ورانہ تعلیم کے اداروں کی تعداد سے حکومت کی کوششوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔

توسیع کے قابل ہو جاتے ہیں ۔ اس لحاظ سے بھی تعلیم روزگار کے بہتر مواقع فراہم کرتی ہے ۔

روزگار کی اقسام اور تعلیم کی منصوبہ بندی

کم ترقی یافتہ ممالک میں بے روزگاری بہت زیادہ ہے ۔ پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے اس لیے یہاں صورت حال کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے ۔ ہمارے ملک میں تعلیم یافتہ افراد ایسے کام کرنے پر تیار نہیں ہوتے جن میں ہاتھ سے کام کرنا پڑتا ہے اور جسمانی مشقت بھی ہوتی ہے ۔ بلکہ وہ ایسی ملازمتیں کرنا پسند کرتے ہیں جن میں جسمانی مشقت کم سے کم ہو ۔ اس لحاظ سے ہمارے ہم وطن محنت کی عظمت سے پوری طرح واقف نہیں ہیں ۔ تعلیم کا یہ کام ہے کہ وہ اس قسم کے رویوں کی بیخ کنی کرے ۔

روزگار کی مختلف اقسام ہیں ۔ روزگار کی یہ اقسام جن بنیادی پیشوں سے تعلق رکھتی ہیں وہ زراعت اور اس کے متعلقات ، صنعت و حرفت ، ذاتی کاروبار یا تجارت ، گھریلو دستکاریاں ، انتظامی ملازمتیں ، معاشی خدمات (یعنی تعلیم ، صحت ، ذرائع آمدورفت وغیرہ) اور تفریحات سے متعلق ہیں ۔

ہر پیشے کے تحت روزگار کے لاتعداد مواقع موجود ہوتے ہیں ۔ ایک بات یاد رہے کہ پیشے کی کسی ایک قسم کو دوسری اقسام سے علیحدہ کرکے نہیں دیکھا جا سکتا ۔ تعلیم پیشے کی ہر قسم اور اس سے متعلق مختلف روزگاروں کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہے اور ان میں توسیع ، اصلاح اور اضافہ کا باعث بھی بنتی ہے ۔

روزگار کے نقطۂ نظر سے تعلیم کی منصوبہ بندی لازمی ہے ۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل امور توجہ کے قابل ہیں ۔

الف) موجود حالات میں روزگار کے کیا مواقع ہیں اور ان مواقع کے مطابق کس قسم کی تعلیمی سہولتوں کی ضرورت ہے ؟

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ ہر فرد کو اپنی بنیادی ضرورتیں پورا کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کام کرنا پڑتا ہے ۔ ان کاموں کو احسن طریقے سے انجام دینے کے لیے تعلیم فرد کو موزوں اور بہتر صلاحیتوں سے مزین کرتی ہے ، جس کے بل بوتے پر وہ کوئی مناسب ذریعہ معاش اختیار کر لیتا ہے ۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض افراد کسی باقاعدہ ادارے میں داخل ہوئے بغیر ایک خاص سطح کی مہارت حاصل کر لیتے ہیں لیکن اس طرح مہارت حاصل کرنے ، کام سیکھنے ، تکنیکیں اور طریقے سیکھنے کے لیے وقت زیادہ صرف ہوتا ہے ۔ اگر انھیں یہی کام کسی ماہر استاد کی نگرانی میں سکھایا جائے تو نہ صرف ان کے کام کرنے کے انداز میں بہتری پیدا ہو سکے گی بلکہ وہ اس کام کو باقاعدہ طریقے سے اور موزوں تکنیکیں استعمال کر کے انجام دے سکیں گے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سلیقہ سے کام کرنے کے ساتھ ساتھ کام کرنے کی کوئی بہتر تکنیک تخلیق کر سکیں ۔

تعلیم یافتہ افراد کے لیے یہ معلوم کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے کہ ان کے لیے روز گار کے کون سے مواقع ہیں اور کون سا روزگار یا پیشہ ان کے لیے زیادہ موزوں ہے ۔ جہاں تعلیم افراد کی صلاحیتوں کی نشوونما اور انھیں روزگار اختیار اور حاصل کرنے میں مدد دیتی ہے وہاں اس سے قومی آمدنی میں بھی اضافہ ہوتا ہے جو مزید ترقی کی راہیں کھولتا ہے ۔ تعلیم سے افراد کے کام کرنے کے طریقے میں بہتری پیدا ہوتی ہے ۔ ان کی اہلیت میں اضافہ ہوتا ہے ۔ ان کی سمجھ بوجھ بڑھتی ہے ۔ ان میں مناسب رویے پیدا ہوتے ہیں ۔ ان کو جدید مہارتوں کے استعمال کے قواعد کا علم حاصل ہوتا ہے ۔ کم سے کم جسمانی قوت استعمال کر کے قلیل وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے ۔ غرض یہ کہ افراد اپنی صلاحیت اور تعلیم کی بنیاد پر بہتر سے بہتر روزگار حاصل کرنے یا اختیار کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ۔

غیر تعلیم یافتہ افراد کے لیے روزگار میں ترقی یا اضافہ کرنا بڑی حد تک ممکن نہیں جب کہ تعلیم یافتہ افراد اپنے ہنر اور مہارت کی وجہ سے اپنے کاروبار میں توسیع کے ذرائع تلاش کرتے ہیں ۔ وہ اس کام کو انجام دینے کے لیے جدید مہارتوں ، علوم اور تکنیکوں سے استفادہ کرتے ہیں اور غیر تعلیم یافتہ افراد کے مقابلہ میں اپنی آمدنی میں اضافے اور کاروبار میں

ہیں اور یوں پیشے وجود میں آتے ہیں ۔ روزگار سے مراد کسی فرد کا کسی ایسے کام میں مصروف ہونا ہے جس کے ذریعے وہ اپنے لیے روزی کما سکے اور اس کام میں مشغول رہتے ہوئے پیداواری انداز میں اس طرح حصہ لے کہ قوم اقتصادی لحاظ سے ترقی کر سکے ۔

معاشرے میں مختلف افراد مختلف پیشے اختیار کرتے ہیں ۔ کوئی فرد ملازمت کرتا ہے ، کوئی کاروبار کرتا ہے ، کوئی مزدوری کرتا ہے ، کوئی زراعت اختیار کرتا ہے اور کوئی گھر بیٹھے دستکاری کا کوئی کام کرتا ہے ۔ غرض یہ کہ مختلف کاموں میں مصروف رہنے کے لیے معاشرے میں مختلف طریقے موجود ہیں ۔ ان میں مصروفیت فرد کی اپنی پسند ، ناپسند یا وسائل کی فراہمی اور ملک کی معاشی و اقتصادی حالات پر منحصر ہے ۔

روزگار کے ان طریقوں کی چار بنیادی اقسام ہیں

1) نچلی سطح پر ایسے غیر مہارت یافتہ لوگ ہیں جو اپنی جسمانی قوت کی بنیاد پر کچھ کام کرتے ہیں اور یہ کام کرکے اپنی روزی کماتے ہیں ۔

2) دوسری سطح پر ایسے لوگ ہیں جو مہارتیں رکھتے ہیں اور ان کی بنیاد پر فیکٹریوں ، کارخانوں اور دفاتر وغیرہ میں ملازمت یا ذاتی کام کرتے ہیں ۔

3) تیسری سطح پر ایسے افراد ہوتے ہیں جو کام کرنے کی مختلف تکنیکوں سے واقف ہونے کی وجہ سے کارکنوں یا اہلکاروں کی رہنمائی کرتے ہیں اور کام کی مناسب نگرانی کرتے ہیں ۔

4) اعلٰی ترین سطح پر ایسے افراد ہوتے ہیں جو پیشہ ورانہ مہارت رکھتے ہیں ۔ وہ نہ صرف کام کی تکنیکوں اور طریقوں سے واقف ہوتے ہیں بلکہ متعلقہ کام کے نظری اور عملی علوم پر بھی عبور رکھتے ہیں ۔ اس طرح وہ نئی تکنیکیں ، طریقے ، نظریات اور ڈیزائن تخلیق کرنے کی صلاحیت کے حامل ہوتے ہیں اور پیشہ ورانہ علم میں اضافہ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں ۔

ان چاروں سطحوں پر افراد انفرادی طور پر آزادانہ یا کسی دوسرے فرد یا تنظیم کے ماتحت رہ کر کام کر سکتے ہیں ۔

اس بات کا اعلان کیا گیا ہے کہ ملک کے تمام علاقوں میں تعلیمی سہولتوں کو پھیلایا جائے گا۔ اس سلسلے میں سکولوں اور کالجوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ تمام علاقوں کو تعلیمی مواقع میں برابر کا حصہ دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔ دیہاتوں میں مدارس کھولے جارہے ہیں۔ ہر بڑے قصبے یا گاؤں میں ہائی سکول قائم کیے جارہے ہیں اور تحصیل کی سطح پر کالجوں کو سہولت فراہم کی جارہی ہے۔ کالجوں میں داخلے کے لیے میرٹ کے علاوہ دیہی کوٹہ بھی مقرر ہے۔ پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے بھی مختلف علاقوں اور طبقات کے لیے کوٹہ مقرر کیا گیا ہے تاکہ محروم طبقات کو تعلیم کی سہولت فراہم کی جاسکے۔ ان تمام کوششوں کے باوجود ہر فرد معاشرہ کو تعلیم کے یکساں مواقع مہیا کرنے کے لیے حکومتی اور معاشرتی سطح پر اور رضاکارانہ طور پر متمول افراد کو مزید سعی و عمل کرنا چاہیے۔

تعلیم اور روز گار

تعلیم کے ذریعے فرد جو مہارتیں، علم اور فنون حاصل کرتا ہے وہی مہارتیں، فنون اور علم اسے ایک پیشہ، ملازمت یا کاروبار اپنانے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ تعلیم جہاں اسے خود شناسی و خدا شناسی کے قابل بناتی ہے وہاں یہی تعلیم اس کو ایسے فنون، مہارتیں، کام کرنے کی صلاحیت، فہم اور تکنیکیں بھی عطا کرتی ہے کہ وہ انھیں سیکھنے کے بعد قوم کی معاشی ترقی میں بھرپور حصہ لے سکے اور اپنے لیے روزی اور بنیادی ضرورتوں کا بندوبست کرسکے، اس طرح تعلیم فرد کو کسی خاص قسم کا ذریعہ معاش اپنانے کے قابل بناتی ہے اور یہ تعلیم کے مختلف مقاصد میں سے ایک اہم مقصد ہے۔

روز گار کی تعریف

ذریعۂ معاش اختیار کرنے کی خاطر انسان کچھ مہارتیں سیکھتا ہے، کچھ تکنیکیں سیکھتا ہے اور کام کرنے کے کچھ طریقے اپناتا ہے۔ اس کے بعد وہ کوئی ایسا کام اختیار کرتا ہے جس میں وہ مہارتیں اور تکنیکیں کام آسکیں۔ اس طرح مختلف کام کرکے لوگ روزی کماتے

جگہ ، مقام ، علاقے یا کسی اور وجہ سے ان میں کوئی واضح فرق نہیں ہونا چاہیے ۔

موجودہ صورت حال

درج بالا امور کو مد نظر رکھا جائے اور ان کی بنیاد پر تعلیمی نظام کا جائزہ لیا جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی بھی ملک میں تعلیمی مواقع کی مکمل طور پر مساوات موجود نہیں ہے ۔ بہر حال ترقی یافتہ ممالک میں بڑی حد تک سرکاری سطح پر اس انداز سے انتظام کیا گیا ہے کہ شدید قسم کی عدم مساوات نظر نہیں آتی ۔ ہمارے ملک میں تعلیمی مواقع میں تفاوت بہت نمایاں نظر آتا ہے یہ تفاوت شہری اور دیہی مدارس میں شدید تر ہے ۔ بہت سے دیہی علاقوں میں ابھی شہروں کے مقابلے میں مناسب تعلیمی سہولتیں فراہم نہیں کی جاسکیں ۔ تعلیمی مواقع میں تفاوت شہری علاقوں میں بھی موجود ہے ۔ ان علاقوں میں مختلف قسم کے سکول ، کالج اور دیگر تعلیمی ادارے نظر آتے ہیں مثلاً انگریزی اور اردو میڈیم ادارے ، پبلک سکول اور عام ہائی سکول اور ایسے سکول جن میں بچوں کے لیے مناسب سہولتیں تک نہیں ہیں ۔

دوسری جانب ایسا بھی نظر آتا ہے کہ جن افراد معاشرہ کے پاس زیادہ وسائل ہیں وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیمی اداروں میں بہتر تعلیم دلوا رہے ہیں ۔ ان میں تعلیمی سہولتیں ، اساتذہ ، عمارات وغیرہ بھی بہتر ہیں ۔ چنانچہ ایسے بچوں کا معیار تعلیم بہتر ہوتا ہے اور اس طرح وہ عام بچوں کے مقابلے میں ملازمتوں کے حصول ، کاروبار اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں سبقت لے جاتے ہیں ۔ البتہ وسائل سے نسبتاً محروم خاندانوں میں بچے یا تو تعلیم حاصل ہی نہیں کر پاتے یا غیر معیاری تعلیم کے حصول سے وہ زندگی کی دوڑ میں محولہ بالا گروہ سے پیچھے رہ جاتے ہیں ۔ اس صورت حال میں ہمارے معاشرے میں طبقاتی تفاوت جاری رہتا ہے ۔ اس تفاوت کو کم سے کم کرنے کے لیے معاشرتی عدل و انصاف کے اصولوں کے تحت مثبت کاوشیں کرنا ہوں گی ۔

حکومت کی سعی و کاوش

حکومت نے اس سلسلے میں خاصی کوششیں کی ہیں ۔ حکومت کی تمام پالیسیوں میں

ان حقوق میں افراد کے لیے تعلیمی مواقع کی مساوات بھی شامل ہے ۔ اس سلسلے میں آئین میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ عوامی نوعیت کے اداروں میں داخلہ کے سلسلے میں نسل، مذہب، ذات، جنس، مقام پیدائش اور رہائش کی بناء پر کوئی تفریق نہیں برتی جائے گی ۔ اس لیے ہر آزاد فرد کو تعلیم کے یکساں مواقع میسر آئیں گے ۔ ہمارے آئین کے باب "پالیسی کے اصول" کے تحت یہ اظہار کیا گیا ہے کہ افراد معاشرہ کے لیے تعلیم کے مساوی مواقع فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی اور ثانوی سطح تک جلد از جلد مفت تعلیم کا بندوبست کیا جائے گا تعلیم کے یکساں مواقع کے بارے میں مندرجہ ذیل امور اہم ہیں ۔

1) ہر فرد کو تعلیمی اداروں میں داخلہ حاصل کرنے کا یکساں حق حاصل ہونا چاہیے ۔

2) تمام تعلیمی اداروں میں یکساں طبی و تعلیمی سہولتیں فراہم کی جائیں اور کسی فرد کو کسی بھی تعلیمی سہولت سے محروم نہیں کیا جانا چاہیے ۔

3) تمام تعلیمی اداروں میں یکساں قابلیت کے حامل اساتذہ مقرر کیے جائیں، تاکہ طلبہ یکساں انداز میں تعلیم حاصل کر سکیں ۔

4) تمام تعلیمی اداروں میں نصاب تعلیم ایک جیسا ہو تاکہ نصاب تعلیم کی بناء پر طلبہ میں تفریق پیدا نہ ہو سکے ۔

5) کم از کم ایک خاص سطح تک تعلیم مفت ہو، تاکہ کوئی بچہ اپنی صلاحیت و استعداد کی نشوونما سے محروم نہ رہ سکے ۔

6) اگر قابلیت، استعداد اور خداداد صلاحیت کی وجہ سے بچوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جانا ضروری ہو تو ایک ہی جیسی صلاحیت و لیاقت کے حامل بچوں کو یکساں تعلیمی مواقع فراہم کیے جائیں اور ان میں معاشی و اقتصادی حالات یا معاشرتی بنیاد پر کوئی تفریق روا نہ رکھی جائے ۔

7) طلبہ کو طبقاتی تفاوت کی وجہ سے کسی بھی تعلیمی سہولت اور موقع سے محروم نہ کیا جائے ۔

8) حکومت کی جانب سے قائم کردہ ادارے ایک ہی سطح اور نوعیت کے ہوں اور کسی

ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے ہر فرد کو صلاحیتوں، استعداد ، قوائے جسمانی ، اور وسعت کے اعتبار سے مختلف پیدا کیا ہے اس لیے مطلق مساوات یا یکسانیات کا تصور ممکن نہیں ہے ۔ مساوات سے یہ قطعاً مراد نہیں ہو سکتی کہ تمام افراد اپنی اکتسابی اور خداداد صلاحیتوں کے اعتبار سے یکساں ہیں اصل میں اس کا مفہوم حقوق میں برابری اور معاشرے میں رکنیت حاصل کرنے کی اہلیت ، اور معاشرے میں موجود مختلف مواقع کے حصول اور استفادہ میں برابر شریک ہونے کے ہیں اور جو معاشرہ انہیں ایسا کرنے سے روکتا ہے یا انہیں ایسی سہولتیں فراہم نہیں کرتا وہ مساوات کے اصول کی خلاف ورزی کرتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے زیادہ دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے بہر حال اس کا فیصلہ انسان ہرگز نہیں کر سکتے اور یہ طے نہیں کر سکتے ہیں کہ فلاں بچے کو یہ موقع دیا جائے اور فلاں کو نہیں ۔

کسی فرد کو معاشرہ میں موجود مواقع سے استفادہ کرنے سے نہیں روکا جا سکتا ۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مساوات سے مراد ، معاشرے میں موجود مواقع اور وسائل کی یکساں تقسیم ہے ، تاکہ افراد معاشرہ ان سے استفادہ کرنے میں مکمل طور پر آزاد ہوں ۔

مواقع کی دستیابی

ہر بچے کو یہ حق حاصل ہے کہ اسے اپنی خداداد صلاحیت اور استعداد کے مطابق نشوونما کا موقع میسر آئے ۔ اگر اسے اپنی اس صلاحیت و استعداد کے مطابق نشوونما کا موقع مل جائے تو وہ بھی معاشرے کی ترقی اور اصلاح میں بھرپور حصہ لے سکتا ہے ۔ مساوات کا مفہوم اس نقطۂ نظر کے مطابق ہی ہوگا ۔ ہر فرد کو ایسے مواقع فراہم کیے جائیں کہ وہ ان مواقع سے استفادہ کرکے ارفع اور اعلیٰ مقاصد حاصل کر سکے ۔ اور معاشرے کی جو سرگرمیاں قانوناً اور اخلاقاً جائز ہیں ان میں تمام افراد بلا لحاظ مرتبہ و تفریق حصہ لے سکیں ۔ اس اخلاقی اور سیاسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے آئین پاکستان کے ابتدائیہ میں کہا گیا ہے کہ "تمام بنیادی حقوق ، جن میں مرتبہ اور مواقع کی مساوات ، اور قانونی مساوات شامل ہیں کی یقین دہانی کی جاتی ہے ، ان میں (افراد کے رویے) معاشرتی و سیاسی انصاف ، پرستش اور روابط کی آزادی بھی شامل ہے ۔"

سے گر کر 43 فیصد پر پہنچے ہیں تو بعض دوسرے مواقع پر یہ نتائج 50 فیصد سے کم اور 60 سے زیادہ نہیں ہوئے۔ اس طرح انٹرمیڈیٹ امتحان کے نتائج عموماً 25 فیصد اور 35 فیصد کے درمیان رہے ہیں ۔ یوں عددی لحاظ سے معیار تعلیم بڑی حد تک مستحکم رہا ہے ۔

تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے ۔ عددی اوسط کے مقابلہ میں علمی کمال اور مہارت توں پر نظر ڈالی جائے ، تعلیمی مقاصد کے حصول کا جائزہ لیا جائے یا طلبا کے کردار اور رویوں کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ آج کے طلبہ کی تعلیمی قابلیت میں کمی واقع ہوئی ہے ۔ اس کے ساتھ ہی امتحانوں میں اعلیٰ نمبر حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے ۔ تاہم عام طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ طلبہ میں علم کے حصول کی لگن ، علم میں گہرائی اور گیرائی ، علم کے اطلاق ، تخلیقی صلاحیت اور محنت میں کمی واقع ہوئی ہے ۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو معیار تعلیم روبہ تنزل ہے ۔

تعلیم کے یکساں مواقع

قومی تعلیمی پالیسی 1979ء میں متعین کردہ قومی تعلیمی مقاصد میں ایک اہم مقصد "پاکستان کے تمام شہریوں کو مساوی تعلیمی مواقع فراہم کرنا" بھی بیان کیا گیا ہے ۔ اس سلسلہ میں چند امور غور طلب ہیں مثلاً تعلیمی مواقع کا کیا مطلب ہے ؟ اور تعلیمی مواقع میں مساوات کا مفہوم کیا ہے ؟

مساوات

دراصل مساوات ، معاشرتی اور سیاسی تصورات سے منسلک ایک تصور ہے ۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو جسمانی توانائی ، ذہنی صلاحیتوں اور ذمہ داریوں کی تقسیم کے اعتبار سے تمام افراد معاشرہ ، بلکہ بنی نوع انسان کے رکن کی حیثیت میں یکساں نہیں ہیں اور نہ ہی ہو سکتے

استحکام ہو ، ہنگامے ہو رہے ہوں اور ان ہنگاموں کی وجہ سے تعلیمی اداروں کو بند کر دیا جائے ۔ انصاف کے مقابلہ میں دھاندلی ، سفارش اور دیگر غیر مہذب ذرائع سے لوگ مراعات حاصل کر رہے ہوں اور غیر مستحق کو سب کچھ مل جاتا ہو ، تو تعلیم پر طلبہ کی توجہ ہرگز مرکوز نہیں رہ سکتی ۔ اس طرح نتائج اور معیار تعلیم میں کمی کے امکانات بڑھ جائیں گے ۔

5) تعلیم میں اساتذہ کے علاوہ تعلیمی سہولتوں کا بھی ایک کردار ہوتا ہے ۔ اگر تعلیمی اداروں میں طلبہ کی تعداد ان میں گنجائش سے زیادہ ہو تو اساتذہ تمام طلبہ پر مناسب توجہ نہ دے سکیں گے ۔ اگر تدریس میں مددگار اشیاء اور طبعی حالات میسر نہ ہوں تو صحیح تدریس ممکن نہیں ہوگی ۔ تعلیمی سہولتوں کا یہ فقدان بھی تعلیمی معیار کی پستی کا سبب بن جائے گا ۔

6) طلبہ کو کن امور کی تعلیم دی جانا مقصود ہے یہ بات نصاب تعلیم کے ذریعے طے کی جاتی ہے ۔ اگر نصاب ، طلبہ کو عملی زندگی کے لیے تیار کرنے کی راہ ہموار نہیں کرتا ، نصاب کے مقاصد اور عملی زندگی میں تضاد موجود ہے ، جائزے اور نصاب میں مطابقت نہیں ہے ، امتحانات طلبہ کو رٹنے پر مجبور کرتے ہیں تو طلبہ کی دلچسپی کا مرکز علمی کمال نہیں ہوگا ۔ یوں طلبہ کے اکتساب اور مہارتوں میں کمی واقع ہوگی جو معیار تعلیم کے گرنے کی وجہ بن جائے گی ۔

کیا ہمارا معیار تعلیم روبہ تنزل ہے ؟

عام لوگوں میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ ہمارا معیار تعلیم گر رہا ہے ، جس کا اظہار اخباروں میں عام طور پر اور امتحانی نتائج کے شائع ہونے پر خصوصی طور سے کیا جاتا ہے ۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ امتحانات میں طلبہ کے کثیر تعداد میں ناکام ہونے کی وجہ معیار تعلیم کا ناقص ہونا ہے ۔ سرسری نظر سے دیکھا جائے تو ایسا ہی احساس پیدا ہوتا ہے ۔ حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے ۔ مختلف برسوں کے امتحانی نتائج کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ثانوی سکول امتحان کے نتائج عام طور پر 50 فیصد اور 60 فیصد کے درمیان رہتے ہیں ۔ کچھ مواقع پر اگر یہ نتائج 50 فیصد

کیا وجوہات ہو سکتی ہیں ؟ یہ بڑا اہم سوال ہے ۔ ذیل میں کچھ عوامل کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے جو ممکنہ طور پر معیار تعلیم کی پستی کا سبب ہو سکتے ہیں ۔

1) تعلیم میں اساسی کردار اساتذہ انجام دیتے ہیں ۔ اگر سکولوں اور کالجوں میں مناسب معیار کے تربیت یافتہ اساتذہ کی کمی ہو ، مناسب تعداد میں اساتذہ موجود نہ ہوں ، اساتذہ دلجمعی اور لگن کے ساتھ اپنے فرائض انجام نہ دیں ، وہ سیاسی الحاق کی بناء پر اپنے فرائض سے غفلت برتیں ، تعلیم کو ایک اہم مشن کے بجائے کمائی کا ذریعہ سمجھنے لگیں ۔ موزوں طریقہ ہائے تدریس استعمال نہ کریں ، انھیں اپنے مضامین پر عبور نہ ہو اور ان کے قول و فعل اور ایمان و عمل میں تضاد ہو تو یقیناً تعلیم کا معیار گر جائے گا ۔

2) بچوں کی تعلیم میں ان کے والدین بھی بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں ۔ اگر والدین غیر تعلیم یافتہ ہونے کے سبب تعلیم کے بارے میں مثبت رویوں کے حامل نہیں ہیں اور وہ اپنے معاشی و سماجی افعال میں اس قدر مصروف ہیں کہ اپنے بچوں پر توجہ نہ دے سکتے ہوں ۔ بچوں کے رجحانات ، دلچسپیوں اور صلاحیتوں کے برعکس ان سے توقعات وابستہ کرتے ہوں اور بچوں کو ایسی تعلیم یا پیشہ ورانہ شعبے اختیار کرنے پر زور دیتے ہوں جو ان بچوں کی صلاحیتوں سے مطابقت نہیں رکھتے تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ تعلیم کے مخصوص میدان میں طلبہ کے نتائج ہماری توقعات سے بہت کم ہوں گے ۔

3) تعلیم کا بندوبست درحقیقت طلبہ کی خاطر کیا جاتا ہے ۔ اگر طلبہ کی ذہنی سطح کسی خاص قسم کی تعلیم کے لیے مناسب نہیں اور وہ والدین کے زور دینے پر یا اپنی ذاتی خواہش کی بناء پر اس شعبۂ تعلیم کو اختیار کر لیتے ہیں یا وہ بے مقصدیت کا شکار ہیں تو معیار تعلیم کے گرنے کے قوی امکانات ہیں ۔

4) سیاسی و سماجی حالات بھی تعلیم پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ اگر معاشرے میں سیاسی عدم

لگانا اگرچہ نسبتاً مشکل ہے لیکن اس کے باوجود اساتذہ اور عامتہ الناس میں یہ تاثر ابھرتا ہے کہ ان امور میں طلبہ کا معیار کیا ہے اور اسے بہت ہی اچھا ، بہتر ، اچھا ، درمیانہ درمیانے سے کم اور غیر تسلی بخش کے پیمانوں سے ناپا جاتا ہے ۔

ہو سکتا ہے کہ عددی اعتبار سے ایک فرد 50 فیصد نمبر لے کر امتحان میں کامیاب ہو جائے لیکن زبان و بیان کے لحاظ سے وہ اس مہارت کا حامل نہ ہو ، جس کی اس طالب علم سے توقع کی جاتی ہے ۔ دیکھا جائے تو وہ طالب علم ، معیار تعلیم کی ایک کسوٹی یا پیمانہ پر تو پورا اترتا ہے تاہم علمی کمال یا مہارت کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو اس کی استعداد پست ہے لہٰذا یہ بات ضروری ہو جاتی ہے کہ ہم معیار تعلیم کے ہر دو پیمانوں کا تعین کریں ۔

نصاب میں درج ذیل مقاصد اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ ہم طلبہ سے کیا توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں ۔ یہی مقاصد معیار تعلیم کا تعین کرتے ہیں ۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ :

الف) مختلف برسوں کے فیصد نتائج اور امتحانوں میں طلبہ کی مجموعی یا مضمون وار کارکردگی کی بنیاد پر جو عددی اوسط **(Mean)** حاصل کی جائے وہ معیار تعلیم کہلائے گی ۔

ب) اگر کسی امتحان میں مجموعی یا مضمون وار انفرادی طور پر طلبہ کی کامیابی کے لیے نمبروں کی ایک کم سے کم حد مقرر کر دی جائے تو وہ مجوزہ حد معیار کہلائے گی ۔

ج) نصاب میں درج مقاصد کی بنیاد پر طلبہ سے جو توقعات وابستہ کی جائیں کم از کم انھیں معیار تعلیم کہا جائے گا ۔

یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ معیار تعلیم ، اکتساب و استعداد کی کم سے کم حد ہے ۔ زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی ۔ ایسے نتائج جو کم سے کم حد سے نیچے چلے جائیں وہ قابل قبول نہیں سمجھے جاتے ۔

معیارِ تعلیم پر اثر انداز ہونے والے عوامل

معیار تعلیم کے برقرار رہنے اور اس میں اصلاح و اضافہ کی بجائے تنزل رونما ہونے کی

معیار تعلیم کی پرکھ

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ، معیار تعلیم وہ کسوٹی ہے جس سے موازنہ کرکے یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ طلبہ کا اکتساب و استعداد قابل قبول ہے یا نہیں ۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ طے کیا جانا ضروری ہو جاتا ہے کہ عددی اوسط کے لحاظ سے وہ کون سا عدد ہے جس سے نیچے طلبہ کا اکتساب و استعداد قبول نہیں کیا جا سکتا اور فلسفیانہ اعتبار سے طلبہ سے جس کمال یا خوبی کا مظاہرہ ضروری ہے وہ کمال یا قابلیت کیا ہوگی ۔

فرض کیجیے کہ ہم کسی جماعت کے طلبہ کے لیے ایک پرچہ سوالات مرتب کرتے ہیں ۔ اور پرچہ سوالات اس جماعت کے طلبہ کو حل کرنے کے لیے دیتے ہیں ۔ اسی پرچہ کو اسی جماعت کے مختلف (دو تین) سالوں میں زیر تعلیم طلبہ سے حل کراتے ہیں ۔ اس آزمائش میں مختلف علاقوں (یعنی شہری ، دیہی) کے علاوہ لڑکوں اور لڑکیوں کو شامل کرتے ہیں ان کے جوابات کے نمبر لگاکر ان کے نمبروں کی اوسط نکالتے ہیں ۔ یہ اوسط عدد معیار قرار دے دیا جاتا ہے ۔ اب ہم مختلف مواقع پر امتحان دینے والے طلبہ سے توقع کرتے ہیں کہ وہ اس اوسط عدد کے مطابق نمبر حاصل کریں گے ۔ اس اوسط عدد کی سطح اور صفات کو جس کی بنیاد پر طلبہ کا اکتساب اور استعداد پرکھی جائے معیار تعلیم کہلائے گا ۔

عددی لحاظ سے معیار کے تعین کا ایک اور طریقہ بھی ممکن ہے ۔ فرض کیجیے کسی مضمون کے امتحان میں یہ طے کر لیا جاتا ہے کہ جو طالبعلم 50 فیصد سے کم نمبر حاصل کرے گا وہ اس مضمون میں ناکام تصور کیا جائے گا ۔ لہٰذا 50 فیصد نمبر ایک عددی معیار سمجھا جائے گا ۔ یوں ہر طالبعلم کے اکتساب کو اسی معیار پر پرکھا جائیگا ۔

بعض صورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے نمبر لگانا ممکن نہیں ہوتا ۔ مثلاً کسی طالبعلم کا خط تحریر کس قدر خوبصورت ہے ۔ اس کے کام کرنے کے طریقے کتنے اچھے اور اصول کے مطابق ہیں ۔ اس کے پڑھنے کا انداز کتنا خوبصورت ہے ۔ وہ کس قسم کی زبان استعمال کرتا ہے ۔ اس کی بول چال اور انداز گفتگو کیسا ہے ؟ ایسی سرگرمیوں ، اعمال اور صفات کے نمبر

والدین سے مسلسل رابطہ ، ٹیوٹوریل گروپ ، بہتر رہنمائی و مشاورت فراہم کرکے اور انتظامی پالیسی اور سالانہ پروگراموں کے شیڈول شائع کرکے بہتر نظم و ضبط پیدا کیا جا سکتا ہے ۔

معیارِ تعلیم

سماجی اور تعلیمی حلقوں میں یہ تاثر عام ہے کہ ہمارا تعلیمی معیار روز بروز گرتا جا رہا ہے ۔ اس چیز کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ واقعی ایسا ہے ؟ معیار تعلیم ہے کیا ؟ معیار پر کون سے عوامل اثر انداز ہوتے ہیں ؟ معیار تعلیم کی پرکھ کا پیمانہ کیا ہے ؟ کیا امتحانات ہی معیار تعلیم کی حتمی کسوٹی ہیں ؟

معیارِ تعلیم کی تعریف

عام زندگی میں مختلف اشیاء کے بارے میں جائزہ لیتے ہوئے ہم عام طور پر دو شرائط سامنے رکھتے ہیں ایک یہ کہ اس کی تعداد ، حجم یا سائز کیا ہے اور دوسرے یہ کہ اس چیز کی صفات اور خوبیاں کیا ہیں ۔ اس طرح ہم کچھ اشیاء و مظاہر کے بارے میں عددی پیمائش کرتے ہیں اور کچھ کے بارے میں غیر عددی یا غیر شماریاتی پرکھ کرتے ہیں ۔ لفظ "معیار" اس لحاظ سے کسی شے یا کام کے تخمین یا جائزہ کا ایک پیمانہ یا پرکھ ہے ۔ اسی طرح تعلیم میں بھی کسوٹی ، شماریاتی لحاظ سے عددی اوسط اور فلسفیانہ اعتبار سے قدر یا علمی کمال ہے ۔ اس نقطۂ نظر سے معیار تعلیم کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے ۔

"علمی مہارتوں میں تدریسی کمال کی وہ سطح یا کسوٹی جس کا اظہار شماریاتی اعتبار سے عددی اوسط کے طور پر یا فلسفیانہ لحاظ سے علمی کمال یا قدر کی صورت میں کیا جائے معیار تعلیم کہلاتا ہے ۔"

اوپر کی بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جس مقررہ اوسط عدد یا قدر سے طلبہ کی علمی استعداد ، صلاحیت ، اکتساب اور مہارت کا موازنہ کیا جائے اسے معیار تعلیم کہیں گے ۔

6) تعلیمی اداروں کی انتظامیہ کی بے توجہی اور عدم منصوبہ بندی

بعض تعلیمی اداروں کی انتظامیہ اپنے اداروں کی ترقی اور طلبہ کی بہبود کو قابل اعتنا نہیں سمجھتی اور وہ ایسی سہولتیں جو ان کے دائرہ کار اور بس میں ہوتی ہیں وہ بھی طلبہ کو فراہم نہیں کرتے ۔ نیز انتظامیہ طلبہ کی نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں کی اہمیت کو فراموش کر دیتی ہے ۔ اس لیے طلبہ اس منفی رویے کے خلاف سراپا احتجاج بن جاتے ہیں ۔

7) مستقبل کا خوف

طلبہ کو معاشرے میں اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے ۔ اس خوف سے متاثر ہو کر وہ تعلیم کی اہمیت سے بے خبر ہو جاتے ہیں ۔ ایسے حالات میں وہ معاشرے اور اس میں موجود نظام کے خلاف بغاوت اور جارحیت پر آمادہ ہو جاتے ہیں ۔

8) ناروا اور تکلیف دہ پابندیاں

بعض اوقات ناروار اور بے جا پابندیاں بھی طلبہ کو منفی رجحانات پر مجبور کر دیتی ہیں ۔ مثال کے طور پر کلاس کو سکول کے وقت سے بہت پہلے بلانا یا چھٹی کے بعد کافی دیر تک روکے رکھنا ، صرف مخصوص دکان سے سٹیشنری یا یونیفارم خریدنا اور عدم تعمیل پر بچوں کو سزا دینا وغیرہ ایسی باتیں ہیں جو ناروا پابندی میں شامل ہیں ۔

نظم و ضبط کے لیے تدابیر

نظم و ضبط پیدا کرنے کے لیے ہر ادارے کے لیے کوئی یکساں فارمولا ترتیب نہیں دیا جا سکتا اس لیے ہر ادارے میں مخصوص حالات کی بنیاد پر اس کا لائحہ عمل مرتب کیا جائیگا ۔ بہر حال عمومی طور پر بہتر منصوبہ بندی ، اساتذہ کا ذمہ داری سے اپنے فرائض انجام دینا ، تعلیمی اداروں میں مناسب سہولتوں کی فراہمی ، طلبہ کی عزت و توقیر اور ان کی رائے کا احترام ،

2) اساتذہ کا کردار

اساتذہ میں سیاسی و سماجی تفریق موجود ہے ۔ نیز بعض اساتذہ مادی منفعت کے رجحانات کے فروغ کی وجہ سے طلبہ کی اخلاقی تربیت کو اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتے ۔ ان میں قول و فعل کا تضاد بھی طلبہ میں نظم و ضبط کا سبب بنتا ہے کیونکہ اکثر معاملات میں انھیں اساتذہ کی رہنمائی میسر نہیں آتی ۔

3) سماجی و سیاسی بے چینی و اضطراب

بعض دفعہ ملک کے سماجی و سیاسی حالات میں انتشار ، افراتفری ، بے چینی اور بے یقینی کی وجہ سے طلبہ اضطراب کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ وہ معاشرے کی مستحکم اقدار سے واقف نہیں ہوتے ۔ جب پورے معاشرے میں تضادات موجود ہوں تو طلبہ کو اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے اور وہ اس کے خلاف مجسم احتجاج بن جاتے ہیں ۔

4) عملی سیاست میں حصہ لینا

طلبہ کا بنیادی کام تعلیم حاصل کرنا ہے تاہم بعض طلبہ کو مختلف سیاسی گروہ استعمال کرتے ہیں ۔ اس بناء پر تعلیمی اداروں میں سیاسی گروہ بندیاں پروان چڑھتی ہیں ۔ طلبہ کی ایک مختصر لیکن طاقت ور تعداد سیاسی جماعتوں کی آلہ کار بن کر طلبہ اور ادارے میں گڑبڑ پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے ۔

5) تعلیمی اداروں میں سہولتوں کی غیر مساویانہ فراہمی

بعض اوقات تعلیمی اداروں میں تعلیمی ، تدریسی اور طبی سہولتیں مساویانہ اور مناسب طور پر فراہم نہیں کی جاتیں اور بعض اوقات چند اداروں میں کچھ سہولتیں مہیا کر دی جاتی ہیں لیکن دوسرے اداروں کے طلبہ عدم توجہ کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ اس سے طلبہ میں ہیجان پیدا ہوتا ہے اور وہ فوری طور پر اپنے شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہیں ۔

ذریعے اس پر کنٹرول کے قابل ہو جائے ۔

طلبہ میں نظم و ضبط کے فقدان کے مظاہرے روز مرہ دیکھنے میں آ رہے ہیں ۔ قطع نظر اس بات کے کہ وہ خود اس کے ذمہ دار ہیں یا نہیں ، بہر حال وہ ایسی سرگرمیوں میں ملوث ہیں جو معاشرے کی اقدار و روایات سے مناسبت نہیں رکھتیں ۔ نظم و ضبط کے فقدان کی کچھ علامات درج ذیل ہو سکتی ہیں ۔

1) کلاسوں میں باقاعدگی سے حاضر نہ ہونا
2) طلبہ کی غیر شائستہ حرکات
3) کلاسوں کا بائیکاٹ
4) طلبہ کے احتجاجی مظاہرے
5) امتحانی مراکز میں ہنگامہ یا بائیکاٹ
6) طلبہ میں گروہ بندی
7) اساتذہ اور سربراہ ادارہ کے ساتھ ناشائستہ رویہ

نظم و ضبط کے فقدان کی وجوہات

طلبہ میں نظم و ضبط کے فقدان کی بہت سی انفرادی اور اجتماعی وجوہات ہو سکتی ہیں چند ممکنہ اور اہم وجوہات ذیل میں بیان کی جاتی ہیں ۔

1) والدین کی بے توجہی

بعض والدین اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ نہیں دیتے لہٰذا کچھ بچے اس بے توجہی کی وجہ سے بچپن ہی میں منفی رویے اختیار کر لیتے ہیں ۔ اس کے ساتھ ہی والدین کے قول و فعل کا تضاد بھی بچوں کو غلط اور صحیح ، نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کے قابل نہیں بننے دیتا ۔ بچے یہی رویے لے کر سکولوں اور کالجوں میں آتے ہیں اور یوں وہ نظم و ضبط سے عاری ہوتے ہیں ۔

ہے بلکہ یہ ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے ۔ مسئلے کی اس اہمیت کے پیش نظر ضروری ہے کہ عدم نظم و ضبط کی وجوہات ، علامات اور رحجانات اور تعلیمی تدابیر پر تفصیل سے بحث کی جائے ۔

نظم و ضبط کا مفہوم

ہم جب کوئی کام کرنے کے لیے صحیح طریقہ اختیار کرتے ہیں تو ہمیں اپنے آپ پر کچھ پابندیاں عائد کرنا ہوتی ہیں اور اس کام میں ہماری مرضی کا دخل نسبتاً کم ہو جاتا ہے ۔ اس طرح ہم اپنے اختیار اور مرضی کو قاعدے ، قانون ، اصول اور طریقے کے تابع کر دیتے ہیں ۔ قاعدے اور قانون کے اس اتباع کو نظم و ضبط کہہ سکتے ہیں ۔

تعلیمی عمل میں نظم و ضبط (ڈسپلن) کا مفہوم درج ذیل امور پر مبنی ہے ۔

1) یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے افراد اپنی فوری خواہشات ، اضطراری کیفیات ، ضرورتوں اور دلچسپیوں کو کسی ارفع و اعلیٰ مقصد کے حصول کے تابع کرتے ہیں ۔

2) یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے ایک فرد دوسرے افراد کو اپنی مرضی ، اختیار یا کردار و اطوار پر قابو حاصل کرنے کے لیے رہنمائی فراہم کرتا ہے ۔

3) نظم و ضبط کے ذریعے طلبہ توجہ کے انتشار ، الجھاؤ اور مشکلات کے باوجود ایک مخصوص طریقے پر مسلسل اور مؤثر انداز میں اپنی مرضی سے تعلیمی عمل میں مصروف رہتے ہیں ۔

4) وہ تکلیف دہ اور انضباطی پابندیاں بھی نظم و ضبط میں شامل ہیں جن کا مقصد طلبہ کو ناپسندیدہ سرگرمیوں اور برے اعمال و عادات سے روکنا ہو تاکہ سیرت و کردار کی تعمیر مثبت انداز میں ہو سکے ۔

مختصراً یہ کہ نظم و ضبط افراد کو اپنے کردار و اطوار پر قابو پانے کے قابل بنانے کا عمل ہے ۔ خواہ یہ عمل ، فرد اپنی ذاتی حیثیت میں انجام دے یا کسی دوسرے فرد کی رہنمائی کے

براہ راست اثر انداز ہوتا ہے ۔ جب لوگ اس کے ذاتی کردار اور پیشہ ورانہ کردار میں عدم مطابقت دیکھتے ہیں تو فوراً ان کے ذہنوں میں یہ خلش پیدا ہوتی ہے کہ جن اصولوں کا پرچار کیا جارہا ہے معلم کا ذاتی کردار ان کے برعکس ہے ۔ لہٰذا معلم کے کردار میں اس تضاد کی بناء پر طلبہ معلم کے سیرت سازی کے کردار سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے ۔ نیز والدین اور دیگر افراد بھی معلم کے ایسے کردار سے مطمئن نہیں ہوتے ۔

ایک پیشہ ور فرد کا ہم پیشہ افراد کے ساتھ بھی ایک تعلق قائم ہوتا ہے ۔ اپنے پیشہ ورانہ مسائل کے بارے میں ان میں اجتماعی سوچ کا اظہار ضروری ہوتا ہے ۔ اس طرح ایک پیشہ سے متعلق افراد کے باہمی روابط سے پیشہ کی ترقی کا امکان پیدا ہوتا ہے اور پیشہ سے متعلق علم میں اضافہ ہوتا ہے اور جدید معلومات ، تکنیکیں ، مہارتیں ایک فرد سے دوسرے ہم پیشہ افراد میں منتقل ہو جاتی ہیں ۔ اس سے پیشہ کی عظمت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ معاشرے کی فلاح و بہبود کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں ۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ہمارے ملک میں مختلف پیشہ ورانہ تنظیوں نے صرف محدود پیمانے کے متعلق ضابطہ اخلاق تجویز کیے ہیں ، جن پر عمل کرنے کے لیے ہر پیشہ کے افراد کو ترغیب دی گئی ہے ۔ مثال کے طور پر پنجاب ایجوکیشن کوڈ میں اساتذہ کے ضابطۂ اخلاق کا ایک جامع خاکہ پیش کیا گیا ہے ، جس پر عمل کر کے ہر معلم پیشہ ورانہ طور پر بہتر معلم ثابت ہو سکتا ہے ۔

طلبہ میں نظم و ضبط

آج کل تعلیم کے مسائل میں ایک اہم مسئلہ طلبہ کے نظم و ضبط کا بھی ہے ۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ سکولوں ، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلبہ اب تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں اتنے سنجیدہ نہیں ہیں جتنے چند سال پہلے تھے یا طلبہ اور اساتذہ اور طلبہ اور والدین کے باہمی تعلقات میں فرماں برداری اور شفقت کے رویے اور جذبات مفقود ہوتے جارہے ہیں ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نظم و ضبط کا مسئلہ صرف پاکستانی تعلیمی اداروں کا ہی نہیں

کسی بھی پیشے سے تعلق رکھنے والے افراد کو اپنے وظائف و اعمال انھی چار صورتوں کے تحت انجام دینا ہوتے ہیں ۔ انھیں اپنے پیشے کی خصوصی ضرورتوں کا دھیان رکھنا پڑتا ہے ۔ تمام اعمال اس انداز سے ادا کرنے ہوتے ہیں کہ پیشے سے متعلق علم ، مہارتیں ، اصول ، قواعد ، ضابطے اور ترجیحات پر کوئی زد نہ پڑے ۔ اخلاقی طور پر ہر پیشہ ور فرد اس امر کا ذمہ دار ہے کہ وہ پیشہ ورانہ علم اور مہارتوں کو صحت کے ساتھ استعمال میں لائے مثلاً ایک استاد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ جس مضمون کی تدریس پر مقرر کیا گیا ہے اس مضمون کے علم کو صحت کے ساتھ اپنے طلبہ کو منتقل کرے ۔ اس علم کو طلبہ تک پہنچانے کے لیے موزوں تدریسی طریقے استعمال کرے ۔ طلبہ میں تفریق و ترجیحات پیدا نہ کرے ۔ ان میں موزوں رویے پیدا کرنے کے لیے سرگرمیاں تشکیل دے ۔ اور ان سرگرمیوں میں تمام طلباء کو یکساں شرکت کا موقع فراہم کرے ۔

جہاں تک عامۃ الناس سے تعلق کا مسئلہ ہے ، ہر پیشہ ور فرد کسی نہ کسی طور لوگوں سے روابط قائم کرتا ہے ۔ رابطہ و تعلق براہ راست ہو سکتا ہے اور بالواسطہ بھی ۔ مثلاً ایک معلم کا براہ راست تعلق بچوں کے والدین سے قائم ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی اس علاقے کے لوگوں سے بھی اس کے روابط پیدا ہوتے ہیں ، جس علاقے میں مدرسہ واقع ہے ۔ مثلاً والدین اپنے بچوں کی علمی ، عملی اور اخلاقی نشوونما اور تربیت کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں ۔ اس سلسلے میں ایک معلم کی پیشہ ورانہ اخلاق کے لحاظ سے ذمہ داری ہے کہ وہ والدین کو متعلقہ معلومات بہم پہنچائے ۔ نیز یہ معلومات ایسے انداز اور الفاظ و زبان میں مہیا کی جائیں جو والدین کے لیے قابل فہم ہوں ۔

ہر فرد معاشرے کے ایک رکن کی حیثیت سے بھی ایک مخصوص کردار ادا کرتا ہے ۔ اس کے ذاتی کردار سے اس کے پیشہ ورانہ وظائف کا اندازہ ہو جاتا ہے ۔ اگر کسی فرد کا ذاتی کردار ان اصول و ضوابط کے مطابق نہیں جن پر اس پیشہ کی بنیاد ہے تو لوگ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی انجام دہی میں بھی مخلص نہیں ۔ یہ بات ان پیشوں اور خصوصاً تعلیم میں بڑی اہم ہے جہاں ایک فرد بیک وقت بہت سے افراد پر

ان اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کردار کی مختلف صورتوں کے لیے قواعد اور اسالیب مقرر کیے جاتے ہیں ۔ اس لحاظ سے ضابطہ اخلاق وہ دستاویز ہے جس میں کسی ایک پیشے سے تعلق رکھنے والے افراد کے پیشہ ورانہ افعال ، وظائف اور کردار کی جہتوں کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے ۔

کسی پیشہ کے خصوصی مسائل کے سلسلے میں صحیح اور غلط کردار کے وہ اصول جن پر اس پیشہ سے تعلق رکھنے والے تمام افراد متفق ہوں ، پیشہ ورانہ اخلاقیات کہلائیں گے ۔

اس سلسلہ میں ایک بات یاد رہے کہ پیشہ ورانہ اخلاقیات کے اصول و ضوابط اپنی امتیازی حیثیت کے باوجود ، انفرادی اور اجتماعی اخلاقی اصولوں سے یکسر علیحدہ نہیں ہوتے مثلاً دیانتداری ، جہاں زندگی کے باقی شعبوں میں ضروری اخلاقی قدر ہے ، وہاں اس کا اطلاق پیشہ ورانہ کردار پر بھی ہوتا ہے ۔

پیشہ ورانہ اخلاق کی دستاویز کی تیاری کی ذمہ داری پیشہ سے متعلق افراد پر عائد ہوتی ہے ، جو وہ آزادانہ طور پر ، مل جل کر تیار کرتے ہیں ۔ یہ کام عموماً متعلقہ پیشہ سے تعلق رکھنے والی انجمنیں ، ایسوسی ایشنیں ، یا یونینیں انجام دیتی ہیں ۔ اس لحاظ سے ضابطۂ اخلاق حکومتی سطح پر دستاویز نہیں ہوتی اور نہ ہی حکومت اسے نافذ کرتی ہے ۔

پیشہ ورانہ اخلاقیات کے عناصر

۔ مختلِف پیشوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی ضرورتیں اور ان کے وظائف و اعمال (Functions) مختلف ہوتے ہیں ۔ تاہم ہر پیشے میں کم از کم درج ذیل امور توجہ کے قابل ہوتے ہیں ۔

الف) خصوصی پیشہ ورانہ وظائف و اعمال

ب) عامتہ الناس سے تعلق

ج) معاشرے کے ایک رکن کے طور پر کردار

د) پیشہ سے متعلق افراد سے روابط

حکومت خواتین کی تعلیم خصوصاً پرائمری تعلیم کے لیے رسمی اور غیر رسمی ہر دو ذرائع استعمال میں لانے کی کوشش کر رہی ہے موجودہ تعلیمی پالیسی اور منصوبے کے تحت بہت سی سکیمیں حکومت کے زیر غور ہیں اور ان میں سے چند ایک پر عمل بھی شروع کیا جا چکا ہے ۔

پنجاب کے قریباً سات کالجوں میں ایم اے اور ایم ایس سی کلاسوں کا اجراء ہو چکا ہے ۔ کالجوں کے ساتھ معلمات کے لیے رہائشی سہولتوں کا بندوبست کیا جا رہا ہے ۔ طالبات کے لیے ہوسٹل تعمیر کیے جا رہے ہیں ۔ اب تک جو سہولتیں فراہم کی گئی ہیں وہ عمودی ہیں جب کہ ان سہولتوں کے افقی پھیلاؤ کی ضرورت ہے ۔ جب تک ہم بنیادی تعلیم (پرائمری ، مڈل اور ثانوی) کو ہر گھر گاؤں اور قریہ تک توسیع نہیں دیتے اس وقت تک خواتین کی تعلیم میں خاطر خواہ خوش آئند انقلاب نہیں آسکتا ۔

پیشہ ورانہ اخلاقیات

کسی بھی کام کو انجام دینے کے اصول ، ضابطے اور قواعد ہوتے ہیں ۔ ہم خواہ کوئی کھیل کھیلیں ، کوئی عمارت تعمیر کریں ، تجارت یا کاروبار کریں ، ملازمت کریں ، سڑک پر چلیں غرضیکہ ہر کام کے لیے ہمیں چند پابندیوں اور اصولوں کی پیروی کرنا ہوتی ہے ۔ اس نقطۂ نظر سے ہر شعبہ زندگی میں کام کرنے والوں کی ایک پیشہ ورانہ اخلاقیات ہوتی ہے ۔

پیشہ ورانہ اخلاقیات کی تعریف

یہ بات عام طور پر مسلم ہے کہ ہر پیشے سے تعلق رکھنے والے تمام افراد کا ایک اجتماعی ضمیر ہوتا ہے ۔ اس اجتماعی یگانگت اور ضمیر کی بناء پر کسی ایک پیشے سے متعلق افراد ، کردار کے کچھ پہلوؤں کو مناسب اور موزوں خیال کرتے ہیں اور بعض کو نامناسب ۔

جب ایک خاص پیشے سے تعلق رکھنے والے افراد پیشہ ورانہ اخلاقیات کے اساسی اصولوں پر متفق ہو جاتے ہیں تو وہ ان اصولوں کی بنیاد پر ایک ضابطہ مرتب کرتے ہیں جس میں

سہولتوں کی کمی کو خاص حد تک پورا کر رہے ہیں تاہم دیہی علاقوں میں بچیوں کو تعلیم دلوانا مشکل ہے ۔

ج) ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں کا زیادہ فاصلے پر ہونا

والدین کی خاصی بڑی تعداد اپنی بچیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے خواہشمند ہونے کے باوجود انھیں ثانوی یا اعلیٰ تعلیم نہیں دلوا سکتی کیونکہ اس قسم کے ادارے ان کی جائے سکونت سے بہت فاصلہ پر قائم کیے گئے ہیں ۔

د) خواتین کی تعلیم کے لیے غیر موزوں نصابِ تعلیم

والدین یہ خیال کرتے ہیں کہ سکولوں اور کالجوں میں جو نصاب تعلیم رائج ہے ، وہ بچیوں کی تعلیم کے لیے موزوں نہیں ہے ۔ ان کا خیال ہے کہ یہ نصاب خواتین کی اصل ذمہ داریوں سے ہم آہنگ نہیں ہے ۔

ہ) اعلیٰ تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم

اعلیٰ تعلیم کے مخصوص اداروں کے علاوہ یونیورسٹیوں میں مخلوط تعلیم کی وجہ سے بہت سے والدین اپنی بچیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے سے گریز کرتے ہیں ۔

خواتین کی تعلیم کی سکیمیں

رسمی تعلیم کے نظام میں سرمایہ اور وسائل کی بے حد ضرورت پڑتی ہے ۔ اس وجہ سے نہ صرف خواتین بلکہ لڑکوں کے لیے بھی خاطر خواہ تعلیمی انتظامات نہیں کیے جا سکے ۔ حکومت کی جانب سے اس سلسلہ میں کوششیں جاری ہیں ۔ تا حال ان تمام کوششوں کے باوجود صرف 33 فیصد بچیاں پرائمری تعلیم حاصل کر رہی ہیں جب کہ موجودہ تعلیمی سہولتیں کم از کم 45 فیصد بچیوں کے لیے کافی ہیں ۔ دیہاتی علاقوں میں صورت حال خوش آئند نہیں ہے ۔

(ب) 1977 کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان کی شرح ناخواندگی

(i) 48.7 فیصد تھی -----

(ii) 84.6 فیصد تھی -----

(iii) 67.8 فیصد تھی -----

(iv) 75.8 فیصد تھی -----

(ج) ناخواندہ افراد کی تعداد میں اس لیے بھی اضافہ ہو رہا ہے کہ

(i) پرائمری سکولوں سے پہلی جماعت میں 40 فیصد بچے سکول چھوڑ جاتے ہیں -----

(ii) والدین تعلیم کے بارے میں مناسب رویہ نہیں رکھتے -----

(iii) آبادی میں بہت اضافہ ہو رہا ہے -----

(iv) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے سٹڈی سنٹر قائم نہیں کیے -----

(د) پاکستان میں صرف:

(i) 19.3 فیصد خواتین خواندہ ہیں -----

(ii) 16.8 فیصد خواتین خواندہ ہیں -----

(ہ) تعلیم کا پہلا گہوارہ

(i) پرائمری سکول ہے -----

(ii) کائنات ہے -----

(iii) گھر ہے -----

(iv) ماں کی گود ہے -----

(و) نظم و ضبط بنیادی طور پر ایک عمل ہے جس کے ذریعہ

(i) افراد تکلیف دہ پابندیوں کو قبول کر لیتے ہیں -----

(ii) افراد کسی دوسرے فرد کے تابع ہو جاتے ہیں -----

(iii) افراد اپنی مرضی سے اپنے کردار و اطوار پر قابو حاصل کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں -----

(iv) افراد کو قانون کا مکمل پابند کر دیا جاتا ہے -----

(ز) نظم و ضبط کے فقدان کی علامات میں یہ بات شامل نہیں ہے۔

(i) طلبہ کی غیر شائستہ حرکات -----

(ii) طلبہ کا امتحان میں فیل ہونا -----

(iii) طلبہ میں گروہ بندی -----

(iv) طلبہ کی طرف سے کلاسوں کا بائیکاٹ -----

(ح) نظم و ضبط کے فقدان کی وجوہات میں ایک وجہ یہ بھی ہے۔

(i) امتحانی مراکز میں ہنگامہ -----

(ii) طلبہ کا کلاسوں میں بے قاعدگی سے حاضر ہونا -----

(iii) احتجاجی مظاہرے -----

(iv) طلبہ میں مستقبل کا خوف -----

(ط) معیار تعلیم سے مراد

(i) وہ فیصد ہے جس سے کامیابی یا ناکامی کو پرکھا جائے -----

(ii) وہ عددی اوسط ہے جس کی بناء پر طلبہ کی استعداد کا موازنہ کیا جائے۔ -----

(iii) وہ مقررہ اوسط عدد اور قدر ہے جس پر طلبہ کے اکتساب اور صلاحیت کو پرکھا جا سکے۔ -----

(iv) وہ مقررہ عددی اوسط اور قدر ہے جس سے طلبہ کی استعداد، اکتساب، رویے اور مہارت کا موازنہ کیا جائے۔

(ی) جب ہم یہ کہتے ہیں کہ معیار تعلیم گر رہا ہے تو ہمارے نزدیک

(i) امتحانوں میں کامیاب ہونے والے امیدواروں کی تعداد میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ -----

(ii) فیصد نتائج کم ہو گئے ہیں۔ -----

(iii) طلبہ کا علمی کمال، مہارتیں اور رویے ہماری توقعات سے کم ہیں۔ -----

(iv) اساتذہ کے تدریسی طریقوں میں تنزل پیدا ہو رہا ہے۔ -----

(ک) روزگار کی دوسری سطح کے پیشوں میں ایسے افراد کی ضرورت ہوتی ہے جو

(i) غیر مہارت یافتہ ہوں اور اپنی جسمانی قوت کی بدولت کام انجام دے سکیں۔ -----

(ii) مہارتوں کی ابتدائی صورتوں سے واقف ہوں اور انہیں آزادانہ استعمال کر سکیں۔ -----

(iii) مختلف اہلکاروں کے کام کی نگرانی کر سکیں اور خود اس کام کی ضرورتوں اور تکنیکوں سے واقف ہوں۔ -----

(iv) محنت مزدوری کر کے اپنی روزی کما سکیں۔ -----

(ل) جدید دور میں کسی روزگار میں ترقی کے لیے صرف محنت و مشقت ہی کافی نہیں بلکہ

(i) پڑھا لکھا ہونا بھی ضروری ہے۔ -----

(ii) متعلقہ کام کی بہتر اور موزوں ترین تکنیک سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ -----

(iii) نئی تکنیکوں کے آلات اور ایجادات کا استعمال کرنا بھی ضروری ہے۔ -----

(iv) اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ -----

(م) تعلیمی منصوبہ میں صرف اس بات پر توجہ مرکوز نہ رکھی جائے کہ موجودہ حالات میں روزگار کے کیا مواقع موجود ہیں بلکہ اس بات کا خیال بھی ضروری ہے کہ

(i) موجودہ مواقع کے مطابق کس قسم کی تعلیمی سہولتوں کی ضرورت ہے؟ -----

(ii) مختلف شعبہ ہائے روزگار میں کتنے افراد کی ضرورت ہوگی؟ -----

(iii) مستقبل میں ٹیکنالوجی میں توسیع و ترقی کے کیا امکانات ہیں اور کیا پیشے وجود میں آسکتے ہیں؟ -----

(iv) لوگ سرکاری ملازمت کی بجائے نجی کام یا کاروبار اپنانے کے لیے بھی تیار ہوں؟ -----

(ن) ترک مدرسہ کی شرح نکالنے کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ

(i) پہلی جماعت میں کل کتنے بچے داخل ہوئے اور پانچویں جماعت میں باقی رہ جانے والے طلبہ کی تعداد کیا ہے۔ -----

(ii) پہلی سے پانچویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے کل کتنے بچے فیل ہوئے اور کتنے مدرسہ چھوڑ کر چلے گئے۔ -----

(iii) پہلی سے پانچویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے کل کتنے بچے فیل ہوئے، کتنے سرٹیفیکیٹ لے کر چلے گئے۔ -----

(iv) پہلی اور پانچویں جماعت کے بچے کے درمیان وہ شرح، جس میں صرف سکول چھوڑ کر چلے جانے والے بچے شامل ہوں اور فیل شدہ اور سرٹیفکیٹ لے جانے والوں کو شمار نہ کیا جائے۔ -----

(س) 1985ء میں مکمل کی گئی ایک تحقیق کے مطابق "ترک مدرسہ" کی شرح

i) 36.7 فیصد ہے۔

ii) 43.0 فیصد ہے۔

iii) 13.9 فیصد ہے۔

iv) 60 فیصد ہے۔

20 - خالی جگہوں کو پُر کیجیے۔

— شرح خواندگی کی کمی کی ممکنہ وجوہات میں سے ایک اہم وجہ ----- ہے۔

— ہمارے ملک میں بچوں کی خاصی تعداد ----- تک تعلیم مکمل کئے بغیر سکول چھوڑ دیتی ہے۔

— پاکستان میں تارک مدرسہ کی اصطلاح کا اطلاق ----- پرائمری تعلیم سے قبل مدرسہ چھوڑ کر چلے جانے والے بچوں پر کیا جاتا ہے۔

— پاکستان میں 1972ء کی ایک تحقیق کے مطابق ----- فیصد بچے سکول چھوڑ جاتے ہیں۔

— اکادمی آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ منیجمنٹ کی تکمیل شدہ تحقیق کے مطابق 12.7 فیصد بچے سکول چھوڑ جاتے ہیں جبکہ ----- فیصد بچیاں پرائمری تعلیم چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔

— ماں اپنی اولاد کے لیے محبت کے جذبات رکھنے کے علاوہ ابتدائی طور پر ----- کی ذمہ

دار بھی ہوتی ہے۔

— خواتین کی خاصی تعداد ملک کے ---- کاموں میں بھرپور حصہ لینے کی خواہش مند ہے۔

— ہمارے ملک میں ابھی تک کچھ لوگ خواتین کی تعلیم کو ---- نہیں سمجھتے ہیں۔

— اعلیٰ تعلیمی اداروں میں ---- تعلیم بھی بچیوں کی اعلیٰ تعلیم میں رکاوٹ کا باعث ہے۔

— اجتماعی ضمیر کی بناء پر کسی ایک پیشے سے متعلق افراد ---- کے کچھ پہلوؤں کو مناسب خیال کرتے ہیں اور بعض کو نامناسب۔

— پیشہ ورانہ اخلاقیات میں جہاں خصوصی پیشہ ورانہ مہارتیں اور مسائل زیر بحث آتے ہیں وہاں عام ---- اقدار بھی افراد کے کردار کے لیے ضروری تصور کی جاتی ہیں۔

— پیشہ ورانہ اخلاقیات کا تعلق کسی پیشے کے خصوصی ---- گے سلسلے میں صحیح اور غلط کردار کے اصول ہیں۔

— ضابطہ اخلاق ، اپنی امتیازی حیثیت کے باوجود ، انفرادی و اجتماعی ---- سے یکسر علیحدہ نہیں ہے۔

— ضابطہ اخلاق ---- طور پر نافذ دستاویز نہیں ہوتی۔

— ہر کام کو انجام دینے کے لیے مقررہ اصول ، قاعدے اور ---- اختیار کرنا لازمی ہوتے ہیں۔

— نظم و ضبط میں ، بعض تکلیف دہ اور ---- پابندیاں بھی شامل ہو سکتی ہیں جن کا مقصد افراد کو غلط کاموں سے روکنا ہو۔

— طلبہ میں نظم و ضبط میں کمی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بعض ---- گروہ انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

— طلبہ زیادہ ---- اور جذباتی ہونے کی بناء پر بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

— بعض اوقات ---- اور بے جا پابندیاں بھی طلبہ کو منفی رجحانات اختیار کرنے پر مجبور

کر دیتی ہیں۔

— روزی کمانے کے لیے فرد کی مصروفیت ----- کہلاتی ہے۔

— پیشوں کی اعلیٰ ترین سطح پر افراد نہ صرف کام کی تکنیکوں اور طریقوں سے واقف ہوتے ہیں بلکہ متعلقہ کام کے ----- علوم پر عبور بھی رکھتے ہیں۔

— تعلیم یافتہ فرد اپنے ----- اور ----- کی بدولت، اپنے کاروبار میں توسیع کے ذرائع تلاش کرنے کا اہل ہوتا ہے۔

— تعلیمی منصوبہ بندی کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ----- میں روزگار کے کیا مواقع ہیں۔

کر دیتی ہیں۔

— روزی کمانے کے لیے فرد کی مصروفیت ----- کہلاتی ہے۔

— پیشوں کی اعلیٰ ترین سطح پر افراد نہ صرف کام کی تکنیکوں اور طریقوں سے واقف ہوتے ہیں بلکہ متعلقہ کام کے ----- علوم پر عبور بھی رکھتے ہیں۔

— تعلیم یافتہ فرد اپنے ----- اور ----- کی بدولت، اپنے کاروبار میں توسیع کے ذرائع تلاش کرنے کا اہل ہوتا ہے۔

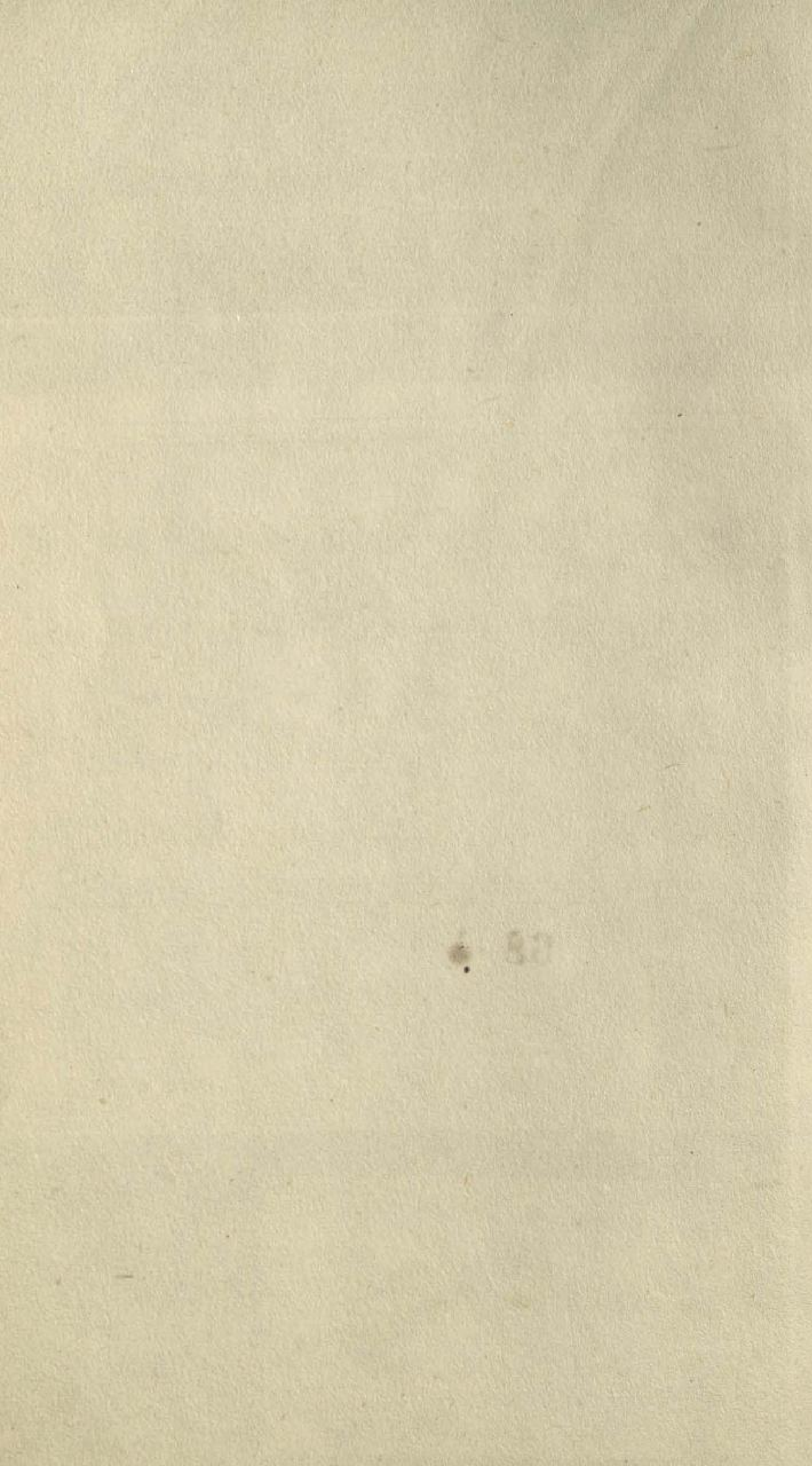
— تعلیمی منصوبہ بندی کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ----- میں روزگار کے کیا مواقع ہیں۔

کتابیات

۱ ۔ ابوالحسنات ندوی — ہندوستان کی قدیم درسگاہیں
۲ ۔ احمد شلبی ، ڈاکٹر — تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ
۳ ۔ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ — نظریۂ پاکستان اور نصابی کتب ، لاہور ۱۹۷۱ء
۴ ۔ سعید اختر ، پروفیسر — ہمارا نظامِ تعلیم
۵ ۔ محبوب رضوی سید — تاریخ دارالعلوم دیوبند
۶ ۔ محمد اکرام شیخ — آبِ کوثر
۷ ۔ محمد امین خان زبیری — مسلم خواتین کی تعلیم
۸ ۔ محمد علی جوہر — قومی اور اسلامی تعلیم کا نظام
۹ ۔ منور ابن صادق — پاکستان کا تعلیمی مستقبل

10. **Govt. of Pakistan** — **Report of the Commission on National Education, Ministry of Education, 1959.**
11. **Govt. of Pakistan** — **National Education Policy and Implementation Programme, Islamabad, Ministry of Education 1979.**
12. **Govt. of Pakistan** — **Action Plan for Educational Development 1983-88 Islamabad, Ministry of Education, November 1983.**
13. **Govt. of Pakistan** — **Pakistan Statistics, Islamabad, Central Bureau of Statistics, 1986.**
14. **Hamid-ud-Din** — **History of Muslim Education.**
15. **Ishtiaq Hussain Qureshi** — **Education in Pakistan, Karachi Ma'aref Ltd. 1975.**
16. **Report of the Students Problems and Welfare, 1964-66.**
17. **The New Education Policy - 1970**
18. **The Education Policy, 1972-80**
19. **University Grants Commission Report or Study Group on Problems of Colleges, 1977.**

10. Govt. of Pakistan — Report of the Commission on National Education, Ministry of Education, 1959.
11. Govt. of Pakistan — National Education Policy and Implementation Programme, Islamabad, Ministry of Education 1979.
12. Govt. of Pakistan — Action Plan for Educational Development 1983-88 Islamabad, Ministry of Education, November 1983.
13. Govt. of Pakistan — Pakistan Statistics, Islamabad, Central Bureau of Statistics, 1988.
14. Hamid-ud-Din — History of Muslim Education.
15. Ishtiaq Hussain Qureshi — Education in Pakistan, Karachi Ma'aref Ltd. 1975.
16. Report of the Students Problems and Welfare, 1964-66.
17. The New Education Policy - 1970
18. The Education Policy, 1972-80
19. University Grants Commission Report or Study Group on Problems of Colleges, 1977.



تیار کردہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور

منظور شدہ ق[illegible] وفاقی وزارتِ تعلیم، حکومت پاکستان اسلام آباد

بموجب مراسلہ نمبر ایف ۳-۱/۸۵ ایس ایس مورخہ ۲۲ جون ۱۹۸۸ء



فرمانِ قائدِ اعظم

آپ کی توجہ صرف حصولِ علم کے لیے وقف رہے، صرف اسی صورت میں آپ اپنے ملک کو دنیا کا عظیم، طاقت ور اور ترقی یافتہ ملک بنا کر سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں۔ (نوجوانوں سے خطاب)

سال اشاعت	ایڈیشن	بار	تعداد اشاعت	قیمت
مئی 1994	اول	نہم	22000	8.00



تمباکو نوشی صحت کے لیے مضر ہے